ربیع الثانی - جمادی الاخری ۱۴۴۵ھ

جلد نمبر:۲/ شمارہ نمبر:۲

اسلامی روایات کا امین، سماج کی دینی
فکری اور تعلیمی اصلاحات کا نقیب

سہ ماہی

صبحِ نو



تعلیمی وملی بورڈ بھاگل پور، بہار 812004

اسلامی روایات کا امین، سماج کی دینی اور فکری اصلاحات کا نقیب

شمارنمبر: ۲ ربیع الثانی تا جمادی الثانی	سہ ماہی	اکتوبر تا دسمبر جلد نمبر: ۲

زیر سرپرستی

حضرت مولانا محمد انصار قاسمی شیخ الحدیث دار العلوم حیدر آباد

صبحِ نو

فی شمارہ	۵۰/روپئے	سالانہ	۲۰۰/روپئے	خصوصی	۵۰۰/روپئے	اعزازی	۱۰۰۰/روپئے

● مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں، قانونی چارہ جوئی کا حق صرف مقامی عدالت کو ہوگا

شعبۂ نشر و اشاعت ◉ تعلیمی و ملی بورڈ بھاگل پور، بہار ۸۰۲۰۰۴

اس شمارے میں

خط وکتابت وترسیل زر کا پتہ

دفتر سہ ماہی صبح نو: تعلیمی وملی بورڈ بھاگل پور چمپانگر، بھاگل پور (812004)

برائے رابطہ: مولانا نادر قاسمی: 7050170809_ای میل subhenau22@gmail.com

کمپوزنگ وڈیزائننگ: افتخار احمد قاسمی 7669238054

اداریہ

فلسطین
اس خوں چکاں حیات کے آلام کیا کہوں؟

مفتی امانت علی قاسمی
استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

فلسطین اس وقت درد والم کی داستان ہے،ظلم و بربریت کی خوں چکاں آلام اپنے جلو میں لیے ہوئے ہے، لاشوں کے ڈھیر، جنازوں کو کندھا دینے والوں کو ڈھونڈ رہی ہے، مکانات و محلات زمین بوس ہورہے ہیں، نہ جانے تاریخ کے کتنے اوراق دفن ہوگئے، علم وتحقیق کے کتنے سوتے خشک ہوگئے ، تاریخی لائبریریاں خس و خاشاک میں تبدیل ہوگئیں ، تاریخ میں پڑھا تھا کہ بغداد کی تمام لائبریریاں دریا میں ڈال دی گئیں تھیں جس سے دریا کا سفید پانی سیاہ ہوگیا تھا، آج فلسطین کے حالات کو دیکھ کر سمجھنا آسان ہوگیا، پورے شہر کو ہی ریت میں تبدیل کردیا گیا ہے، عالی شان عمارتوں پر گرتے بم اور اس سے اٹھتے دھوؤں کو دیکھ کر دل بیٹھ سا جاتا ہے، کس قدر مضبوط قلب وجگر کے ہیں وہ لوگ جو استقامت کے ساتھ اپنی عزیمت کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور اپنی باری کا انتظار کررہے ہیں، تمام تر آلات حرب کا استعمال غیر انسانی طور پر عالمی قوانین جنگ کو بالائے طاق رکھ کر کیا جارہا ہے ، بلکہ بہت سے ہتھیاروں کو پہلی بار فلسطینی معصوموں پر آزمایا جارہا ہے، ماؤں کے اجڑتے آشیانے ،یتیم ہوتے بچے، خون میں لت پت خاکی اجسام، اسپتالوں کے قبرستان میں تبدیل ہونے جیسے واقعات نے پوری انسانیت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے، انسانی لاشوں کے ساتھ جس درندگی اور وحشیانہ سلوک کا مظاہرہ ہوا ہے کہ بس!

کہہ دوں تو دل سے خون کا چشمہ ابل پڑے
اور چپ رہوں تو منہ سے کلیجہ نکل پڑے

فلسطین تاریخ کے آئینہ میں:

فلسطین قدیم زمانے سے ہی حق و باطل کی رزم گاہ رہا ہے، لیکن یہود جن بنیادوں پر دعوی کرتے ہیں اور اس میں کچھ بھی صداقت نہیں ہے، اسلام کے بعد اور اسلام سے پہلے اس جگہ پر سب سے کم یہود آباد رہے ہیں، یہ جگہ نہ یہود کی جائے پیدائش ہے اور نہ ہی ان کی جائے حکومت ،تاریخی بنیادوں پر اگر دیکھا جائے تو یہود اپنے دعوے میں سب سے زیادہ کمزور نظر ہیں؛ لیکن ظلم و بربریت جو یہود کی سرشت میں داخل ہے اس کی بنیاد پر یہودی طاقت کا مظاہرہ کرکے اور عرب اقوام کو کچل کر فلسطین پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور ایک بڑے حصے پر قبضہ بھی کر چکے ہیں۔لیکن تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہود اس جگہ پر کئی بار ذلیل ہو چکے ہیں اور آئندہ بھی ذلت ورسوائی ان کا مقدر ہے۔بابل کے حکمراں بخت نصر نے بیت المقدس کے ہیکل سلیمانی کو ڈھا کر یہودیوں کو وہاں سے باہر نکال دیا، پھر جب پہلی صدی ق م فلسطین پر رومیوں کا قبضہ ہوا اور انھوں نے اپنی فطرت کے مطابق بغاوت کی تو ۷۰ء رومیوں نے چھ لاکھ یہودیوں کو قتل کیا اور ہزاروں کی تعداد میں یہودیوں کو غلام بنایا۔۴۰۰ء سے ۶۳۶ء تک بازنطینی فلسطین پر قابض رہے۔

اسلام کی آمد کے بعد ۱۵ ہجری میں جب مسلمانوں نے فلسطین کا محاصرہ کیا اور چالیس روز کے بعد عیسائیوں سے مصالحت ہوئی جس میں یہ تھا کہ مسلمانوں کے خلیفہ اس معاہدہ پر دستخط کرنے خود آئیں؛ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ، خود معاہدہ پر دستخط کرنے فلسطین گئے۔مسلمانوں کے فلسطین پر حکومت کرنے کے بعد ۴۹۲ھ مطابق ۱۰۹۹ء میں پہلی صلیبی جنگ ہوئی اور بیت المقدس صلیبیوں کے ہاتھ میں چلا گیا، اس کی بازیابی کے لیے اللہ تعالی نے سلطان صلاح الدین ایوبی کو پیدا فرمایا، سلطان ایوبی نے ایک مضبوط فوج تیار کی اور بالآخر ۵۸۳ھ ۱۱۸۷ء میں بیت المقدس پر دوبارہ اسلامی پرچم لہرانے لگا۔اس طرح آپ دیکھ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے قبضہ میں آنے کے بعد صرف نوے سال تک فلسطین پر مسلمانوں کا قبضہ نہیں رہا ہے جب کہ اس پورے عرصے میں یہاں یہود آباد نہیں ہوئے ہیں۔

صہیونی تحریک کا آغاز:

سب سے پہلی مرتبہ ۱۸۸۰ء میں کچھ یہودی خاندان فلسطین میں آ کر آباد ہوئے، پھر ۱۸۹۷ء میں یہودی تحریک معرض وجود میں آئی جسے ''صہیونی تحریک'' کہا جاتا ہے، جس کا مقصد فلسطین پر قبضہ کرنا اور ہیکل سلیمانی تعمیر کرنا تھا، ۱۹۰۱ء میں ہرزل نے ترکی خلیفہ سلطان عبد الحمید الثانی، کو لالچ دیا کہ آپ فلسطین میں یہودیوں کی مملکت کے قیام کی اجازت دے دیجئے ، یہودی ترکی کا سارا قرضہ چکا دیں گے، اس وقت خلافت عثمانیہ معاشی بحران کا شکار تھی لیکن سلطان عبد الحمید نے نہ صرف ان کے پیش کش کو ٹھکرا دیا دیا؛ بلکہ ان کی غیرت ایمانی جوش میں آ گئی انہوں نے کہا ہم اس وطن کی ایک بالشت زمین بھی اس وقت تک نہیں دیں گے جب تک کہ اس پر ہمارا خون نہ بہ جائے، یہودی اس بات پر سلطان کے مخالف ہو گئے اور ۱۹۰۹ء میں سازش کے ذریعہ ان کو معزول کر دیا، اس طرح سلطان عبد الحمید الثانی پہلے خلیفہ ہیں جنہوں نے فلسطین کے لیے اپنی سلطنت اور بادشاہت گنوادی۔ ۱۹۱۴ء میں جب پہلی جنگ عظیم برپا ہوئی تو اس دوران وائز مین نامی ایک یہودی نے برطانیہ کو یہ پیش کش کی کہ اگر جرمنی پر فتح کی صورت میں فلسطین میں یہودیوں کا قومی وطن بنا دیا جائے تو یہودی اس جنگ کا سارا خرچہ برداشت کرنے کو تیار ہیں، حکومت برطانیہ اس کے لیے راضی ہوگئی اور ۲ نومبر ۱۹۱۷ء میں یہ خفیہ معاہدہ ہو گیا جسے تاریخ میں ''اعلان بالفور'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جنگ عظیم میں جرمنی کے ساتھ ترکی حلیف کی حیثیت سے شریک ہوا اور جرمنی کی شکست کی وجہ سے خلافت عثمانیہ کے حصے بخرے کر دیے گئے اور فلسطین کو برطانیہ کے زیر کنٹرول دے دیا گیا، اس طرح اسرائیل کے قیام کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا شروع ہو گیا اور یہودی تیزی کے ساتھ ہجرت کر کے فلسطین میں آباد ہونے لگے، بلکہ برطانیہ کی نگرانی میں فلسطین میں نئی بستیاں تعمیر کر کے یہود کو بسایا جانے لگا، بہت سی جگہوں پر غریب مسلمان کاشت کاروں سے ان کی زمینیں مہنگی قیمت پر خریدی گئیں۔ اس طرح یہودی بڑی تعداد فلسطین میں آباد ہو گئے، مسلمانوں نے یہودیوں کے آباد ہونے کی مخالفت کی اور مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان مسلح مزاحمت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

۱۹۳۸ء میں برطانیہ نے مسئلہ فلسطین کو حل کرنے کے لیے تقسیم کی تجویز پیش کی

۱۹۴۵ء میں دوسری عالمی جنگ کے خاتمہ کے بعد اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آیا، جس کا مقصد بین الاقوامی سطح پر امن و امان کا قیام اور ملکی تعمیر وترقی تھا، جس کا صدر مقام امریکہ بنایا گیا، ۱۹۴۷ء برطانیہ نے اقوام متحدہ کی فلسطین کمیٹی کو مطلع کیا کہ اگر فلسطین کے مسئلہ کو جلد حل نہیں کیا گیا تو برطانوی فوجیں فلسطین سے واپس چلی جائیں گی برطانیہ کے اس اطلاع کے بعد ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے فلسطین کی زمین کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا اور اس کا ۵۵ فیصد حصہ اسرائیل کو دیا گیا یعنی ساڑھے چار ہزار مربع میل کا علاقہ عربوں کو، ۵۳۳۸ مربع میل کا علاقہ یہودیوں کو اور یروشلم کے گردنواح کا ۲۸۹ مربع میل کا علاقہ اقوام متحدہ کے تحت کر دیا گیا۔ یہ تقسیم انتہائی غیر منصفانہ تھی کہ فلسطینیوں کی زمین کو ان کے آبادی کی کثرت اور اپنی حقیقی زمین کے وارث ہونے کے باوجود ان سے چھین کر اسرائیل کو دے دی گئی، عربوں نے اس فیصلے کو قبول نہیں کیا اور عرب اسرائیل جنگ کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا ان جنگوں میں ہمیشہ مسلمانوں کو نقصان ہوا جانی مالی نقصان کے علاوہ یہودیوں نے فلسطین کی زمین پر مزید قبضہ کر لیا، اس طرح آج وہ فلسطین کے اکثر حصے پر قابض ہو گئے ہیں۔ اس پوری تاریخ میں کہیں بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ یہودیوں کا اسرائیل کی زمین پر کوئی حق ہے۔

نئی جنگ اور اس سے وابستہ امیدیں:

موجودہ ۷/اکتوبر ۲۰۲۳ء کی جنگ سے کچھ امیدیں قائم ہوئی ہیں، اسرائیل کے ناقابل تسخیر ہونے کا بھرم ٹوٹ گیا ہے، نہتے فلسطینیوں نے اسرائیل پر اقدامی حملہ کر کے ان کی چولیں ہلا دی ہیں، اسرائیل میں پہلی مرتبہ خوف ودہشت پسرا ہے، جو اسرائیل اب تک نہتے فلسطینیوں پر ظلم کرتا آ رہا تھا اب انہیں بھی آئندہ کے لیے یہ احساس ضرور ہو گیا ہوگا کہ فلسطین پر آسانی سے قبضہ نہیں کیا جا سکتا ہے، اس مرتبہ فلسطین کے جانبازوں نے ہر اعتبار سے اسرائیل کو اپنے مقصد میں ناکام بنا دیا ہے، ان کی بھاری بھرکم حیرت انگیز ٹینک جس کی ہیبت پوری دنیا پر بیٹھی ہوئی تھی فلسطینیوں نے اپنے دیسی ہتھیاروں سے اسے تباہ کر دیا ہے، جس نے ثابت کر دیا کہ راہ عزیمت کے مسافر ہر مشکل کو پار کر لیتے ہیں، جنگ میں مسلمانوں کا بڑا نقصان ہوا ہے؛ لیکن نقصان تو ہمیشہ سے ہو رہا ہے، فلسطین کے پاس کھونے کے لیے کچھ نہیں ہے ہاں اس جنگ میں

انہوں نے بہت کچھ حاصل کیا ہے، پہلی مرتبہ اسرائیل کو وہ درد دیا ہے جسے اسرائیل عرصے تک نہیں بھول پائے گا، یہ زخم ہمیشہ انہیں ٹیس دیتا رہے گا، آئندہ کے لیے مسئلہ فلسطین پوری دنیا کا ایک حساس موضوع بن گیا ہے، انہوں نے قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کر کے اور اس کی ویڈیوز بنا کر دنیا کے سامنے اسلام کی اصل تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے، دنیا جس کے دہشت گرد ہونے کا شور مچا رہی ہے انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ وطن کی آزادی اور اپنی زمین کو حاصل کرنے کا نام دہشت گردی نہیں ہے۔ اس جنگ نے یہ پیغام دیا ہے کہ عزیمت اور حوصلوں سے قومیں زندہ رہتی ہیں، ہتھیاروں سے نہیں۔ امید یہی ہے کہ مستقبل میں فلسطین کا مسئلہ ضرور حل ہوگا، اور مستقبل انشاء اللہ فلسطین کے سپاہیوں اور جانبازوں کا ہوگا۔

امت مسلمہ کی ذمہ داری:

اس وقت امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے کہ فلسطینیوں کا درد محسوس کریں، اس لیے کہ پوری امت مسلمہ ایک جسم کی مانند ہے فلسطینیوں کا درد پوری مسلم امت کا درد ہے، آج ضرورت ہے کہ پوری انسانیت کو مسئلہ فلسطین سے واقف کرایا جائے، نسل نو کو فلسطین کی حقیقت سے آگاہ کیا جائے، اسرائیل کی بربریت اور فلسطین کی مظلومیت کو واشگاف کیا جائے، امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے کہ فلسطین کے جانبازوں کا ہر ممکن تعاون کریں، ان کا دفاع کریں، ان کی کوششوں کو سراہیں، عالمی پلیٹ فارموں پر فلسطین کا قضیہ پیش کیا جائے، نہ صرف آج؛ بلکہ مستقل کے لیے اسرائیل کا معاشی بائیکاٹ کیا جائے، ان کے پروڈکٹوں کو مختلف صورتوں میں عام لوگوں کے ذہنوں میں بٹھایا جائے اور اس کے خریدنے کے نقصانات پر عمومی گفتگو کی جائے۔ فکری محاذوں پر بھی جنگ ہے، اسرئیل کی حمایت اور ان سے فکری وابستگی رکھنے والے لوگ مختلف طرح کی تحریریں لکھ رہے ہیں ضرورت ہے کہ اس کا مثبت اور مسکت جواب دیا جائے، جھوٹے پروپیگنڈوں کے ذریعہ فلسطین کے کاز کو نقصان پہونچانے کی کوشش ہو رہی ہے، میڈیا کے ذریعہ بھی فکری یلغار ہو رہی ہے آج اس پر قدغن لگانے کی ضرورت ہے۔

غرض کہ آج زبان وقلم، میڈیا، معیشت، افکار اور تلوار ہر محاذ پر جنگ ہے اور ہم مختلف جہتوں سے فلسطینی مسلمانوں کی مدد کر سکتے ہیں۔

افادات اکابر

ہماری تعلیم گاہیں اورتربیت کا فقدان
ایک لمحہ فکریہ

حضرت مولانا اکرام علی صاحبؒ سابق شیخ الحدیث جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل گجرات

ترتیب: مولانا محبوب عالم مظاہری

استاذ جامعہ رشید العلوم قصبہ چمپا نگر

تعلیم گاہوں کی ضرورت ہر زمانہ میں محسوس کی گئی ہے اور جب تک یہ دنیا قائم ہے ضرورت محسوس کی جاتی رہے گی، پہلے علمی اداروں کو کچھ لوگ بناتے ہیں اور پھر وہ ادارہ بہت سارے لوگوں کو بناتا ہے، گویا علمی ادارہ انسان ساز فیکٹری ہے، مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تعلیم گاہوں سے لوگ بنتے بھی ہیں اور بگڑتے بھی ہیں، تعلیم کے ساتھ اگر اچھی تربیت نہ ہوتو صرف کورس پڑھ لینے سے انسان، انسان نہیں بنتا ہے، انسان اپنے عمل، کردار واخلاق سے انسان بنتا ہے، ایک شاعر نے کیا خوب کہا تھا۔

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں آدمی آدمی بناتے ہیں

اسی لیے آسمانی کتابوں کے ساتھ انبیاء بھی بھیجے گئے، اگر صرف کتاب سے انسان بن جاتا تو انبیاء کو کیوں بھیجا جاتا، قرآن کے ساتھ سرور انبیاء بھیجے گئے، معلوم ہوا کہ تعلیم قرآن کے ساتھ تربیت کی بھی ضرورت ہے اور جب ابوبکر وعمرؓ کے لیے مربی کی ضرورت ہے تو ہمہ شما کے لیے کیوں نہیں ضروری ہوگا؟

اگر تربیت اچھی ہوتو دنیوی ادارہ میں انسان دین دار بن سکتا ہے اور اگر تربیت نہ ہو یا

خراب تربیت ہوتو دینی ادارہ میں بھی انسان دنیادار بن سکتا ہے،علم کا حاصل کرنا بیشک ایک اہم فریضہ ہے،مگر علم کا ایک اہم مقصد عمل ہے،علم کے مطابق اگر عمل نہ ہوتو پھر عالم وجاہل میں فرق نہیں ہوتا،عمل کے لیے تمرین ومشق کی ضرورت ہے اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے کہ استاذ تربیت یافتہ ہو تاکہ وہ تعلیم گاہوں کے ماحول کو اپنی تربیت سے اچھا بنادے اور اچھے ماحول کا اثر انسانی ذہنوں پر پڑتا ہے، اگر استاذ تربیت یافتہ نہ ہوتو پھر وہ تعلیمی اداروں میں اچھا ماحول نہیں بنا سکتا اور اگر استاذ بُرے مزاج کا ہوتو ماحول کو بگاڑ ڈالے گا اور اس کے بُرے اثرات سے طلبہ متاثر ہوکر بداخلاق اور بدعمل ہوں گے، برطانیہ میں چھوٹے چھوٹے بچوں کو گھناؤنی تصویریں ٹی وی کے ذریعہ دکھائی جاتی ہے اور پھر معلم اور معلمہ ان کو جنسی تعلقات کی ٹریننگ دیتے ہیں۔

اب آپ سوچئے کہ ایسی انسانیت سوز ماحول میں معصوم بچوں کا کیا حال ہوگا، میں نے انگلینڈ کے کالج واسکول کا ماحول دیکھ کر مسلمانوں سے کہا تھا کہ انگلینڈ اور دیگر مغربی ممالک کی جاہلیت،عرب جاہلیت سے بھی آگے بڑھ گئی ہے،لوگوں نے پوچھا کیسے؟ تو میں نے بتایا کہ عرب جاہلیت کی حقیقت صرف اتنی تھی کہ انسانیت پر محنت چھوڑ دی گئی تھی بس لوگ خودبخود حیوان بن گئے اس زمانے میں حیوان بنانے کے لیے کوئی اسکول وکالج نہیں کھولے گئے تھے،آپ نے کبھی یہ نہ سنا ہوگا کہ ابوجہل،ابولہب نے عرب میں حیوان بنانے کا کوئی اسکول کھولا تھا،انگلینڈ اور مغربی ممالک کی جاہلیت یہ ہے کہ انسانیت پر محنت چھوڑ دی گئی اور حیوان بنانے کی محنت ہورہی ہے، اس کے لیے اسکول اور کالج کھولے جارہے ہیں،اب آپ بتائیں کہ صرف انسانیت پر محنت چھوڑ دی گئی تو اس کے نتیجے میں ابوجہل اور ابولہب پیدا ہوئے اور جہاں انسانیت پر محنت چھوڑنے کے ساتھ حیوانیت پر محنت ہورہی ہو وہاں کتنے بڑے ابولہب اور ابوجہل پیدا ہوں گے،مغربی ممالک میں ہمارے جو مسلمان بھی گئے ہوئے ہیں انگریزوں نے مسلم بچوں کو دین سے بیگانہ کرنے کے لیے اسکول کالج کھولے ہیں اور معصوم بچوں کی معصومیت کا خون کررہے ہیں،اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے مسلمان بچے جیسے جیسے جوان ہوتے ہیں،ان کی حیوانیت بھی جوان ہوتی ہے اور وہ اپنی حیوانیت اور خواہشات نفس کو پورا کرنے کے لیے مذہب سے آزاد اور ماں باپ سے آزار ہوتے جارہے ہیں۔

بہر حال میں یہ عرض کررہا تھا کہ انسان بنتا ہے انسان کی تربیت سے؛ اس لیے مدارس

میں تعلیم کے ساتھ تربیت کی سخت ضرورت ہے، یہی وقت بچوں کے بننے، بگڑنے کا ہوتا ہے، ہمارے اسلاف نے بچے بچیوں کی تربیت پر محنت کی تو ان کا ماحول جنت کا ماحول بنا اور آج ہم لوگ بچے بچیوں کے بگاڑ پر محنت اور مال خرچ کر رہے ہیں تو ہمارا بنا ہوا ماحول بگڑتا جا رہا ہے، خالق کائنات نے دنیا کو دو مقصد سے پیدا فرمایا ہے(۱) علم (۲) عبادت اور دونوں میں رشتہ باپ، بیٹا درخت اور پھل جیسا رکھا، جس طرح باپ کے بغیر بیٹا اور درخت کے بغیر پھل کا وجود ناممکن ہے اسی طرح علم کے بغیر عبادت ناممکن ہے، کرنے کا کام ہو یا کہنے کی بات ہو علم کے بغیر نہ کوئی کام کیا جاسکتا ہے اور نہ کوئی بات کہی جاسکتی ہے۔

تعلیم گاہ خواہ دینی ہو یا دنیوی اس کا مقصد قوم کو تباہی سے بچا کر کامیاب زندگی عطا کرنا ہے، علم کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کرتی، جب قوم میں گراوٹ آجاتی ہے تو انہیں تعلیم گاہوں کے تعلیم یافتہ افرادان کو پستی سے نکال کر عروج والی زندگی دیتے ہیں، بیمار قوم کو بیماری سے نجات دینے کے لیے تعلیم گاہ، ہاسپٹل اور شفاخانہ اور یہاں کے تعلیم یافتہ معالج ڈاکٹر کی حیثیت رکھتے ہیں، قوم میں بیماری دو طرح کی ہوتی ہے، جسمانی اور روحانی، جسمانی بیماری سے نجات دلانے کے لیے دنیوی تعلیم گاہوں کے ڈاکٹروں کی ضرورت پڑتی ہے اور روحانی بیماری سے نجات دلانے کے لیے دینی تعلیم گاہوں کے علماء وفضلاء کی ضرورت پڑتی ہے۔ آج کے دور میں جسمانی امراض کی کثرت ہے اور نئے نئے امراض ایسے روپ میں آرہے ہیں کہ دنیا کے ڈاکٹر حیران ہیں، نہ کبھی ایسا مرض دیکھا تھا اور نہ سنا تھا اور نہ معلوم آئندہ اور کیسے کیسے امراض رونما ہونے والے ہیں اس کے لیے جسمانی ڈاکٹر کوشش کر رہے ہیں اور اس کے ریسرچ میں مصروف ہیں۔

''خلاصہ کلام یہ کہ ہمیں دونوں طرح کی تعلیم گاہوں کی ضرورت ہے اور تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی ضروری ہے تاکہ علم کے ساتھ اخلاق وکردار بھی سنت وشریعت کے مطابق ہوسکے اسی طرح دنیوی تعلیم گاہوں میں لڑکے اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم انتہائی مضر ہے اس سے جنسی تعلقات تیزی سے پروان چڑھتے ہیں، لہذا مخلوط تعلیم سے احتراز لازم ہے، ہاں دونوں کے لیے جدا جدا تعلیم گاہوں کا نظم کیا جائے اور پردہ کے ساتھ اعلی تعلیم دی جائے، انشاء اللہ حالات کے انقلاب میں یہ مفید ثابت ہوں گے، اللہ رب العزت عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

مسئلہ فلسطین

فلسطین اور ہم

مفتی محمد نوشاد نوری قاسمی
استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

فلسطین یعنی ایک ڈائری درد والم کی، ایک داستان عزیمت و استقلال کی، ایک تاریخ جفاکشی و مردانگی کی، کتنا عزیز اور لذیذ ہے فلسطین کا تذکرہ اور کتنی تلخ اور تکلیف دہ ہے اس کی صورت حال۔

فلسطین کے بارے میں کیا لکھا جائے؟ وہ جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کی چھ آیتوں میں ''بابرکت سرزمین'' کہا، ارض مقدس کہا، اس کے انجیر اور زیتون کی قسم کھائی، جسے قبلہ اول بنایا گیا، جہاں انبیاء کرام علیہم السلام بسائے گئے، وہ حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیھما السلام کی جولان گاہ، وہ حضرت داود اور سلیمان علیہما السلام کی شان وشوکت کا گواہ، وہ رزم و بزم کی سرزمین، وہ حضرت مریم علیھما السلام کی طہارت و پاک دامنی کا امین اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سرگرمیوں کا مرکز۔

اسلامی نقطہ نظر سے دیکھیں تو پیغمبر خاتم النبیین کی معراج کی منزل، منصب امامت انبیاء کا چشم دید، وہ مجاہدین کا نخل تمنا، وہ عدل فاروقی کی دلیل اور عہد عمری کا محضر نامہ، وہ اجداد کی امیدوں کا مرکز اور اسلامی برکت سے معمور، اس کی مسجد تین اہم مساجد میں سے ایک، اس کے باشندے، عزیمت و اخلاص کے پیکر، اس کی خواتین، صبر وشجاعت کا کوہ ہمالیہ، اس کے بچے، شعلہ

اور شبنم کا آمیختہ اور اس کے مرد، مرد میداں بھی اور مرد قرآں بھی، بزم کی شمع اور رزم کا فولاد بھی۔

قصہ مختصر یہ کہ اس سرزمین کو دشمنوں کی نظر لگ گئی، ایک غدار، عہد شکن، ظالم اور جابر قوم، قوم یہود کو وہاں بسانے کے ارادے نے فلسطین کی رونق چھین لی، یہودیوں کو ان کے گندے اخلاق اور کردار کی وجہ سے دنیا کے ہر ملک سے بھگایا جارہا تھا، ہٹلر نے جرمنی میں اس کی نسل کشی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی بالآخر مسلمانوں نے ہی کچھ یہودیوں کو پناہ دی، انہیں بچایا، کھانے کو کھانا اور رہنے کو گھر دیا مگر یہ غدار قوم اپنی عادت کے مطابق تمام تر احسانات کو فراموش کر گئی، سازشیں ہوئیں، منصوبے بنے، فلسطین میں یہودی حکومت قائم کرنے کا فارمولہ تیار ہوا، جس تنظیم نے اس جرم اور ظلم کا بیڑا اٹھایا اس کو صہیونی تحریک کہتے ہیں، سلطان عبدالحمید ثانیؒ کے سامنے یہ مطالبہ رکھا، ایمانی غیرت وحمیت سے لبریز خلیفہ نے صاف منع کر دیا، تاریخ نے ان کے فیصلہ کو محفوظ رکھا، سازشی ۱۹۴۷ء کو فلسطین کو تقسیم کیا گیا ۱۹۴۸ء میں یہودی حکومت قائم کر دی گئی جس کو برطانیہ اور تمام مغربی طاقت نے فوراً تسلیم کرلیا۔

۱۹۴۸ سے اور آج کا دن ہے یہودیوں نے کبھی کسی معاہدہ، کسی قرارداد، کسی اپیل اور کسی قانون کا کوئی لحاظ نہیں رکھا، بڑی بے دردی سے قتل وغارت گری کی، نہ بوڑھوں کا خیال، نہ بچوں کا لحاظ اور نہ ہی بیماروں اور عورتوں پر کوئی ترس اور رحم، مکانات، مساجد، اسکول، مدارس، ہاسپٹلز، دکانیں، بازار، قبرستان اور دیگر عوامی مقامات اور آبادیوں کو مکمل درندگی کے ساتھ تباہ کئے، انہیں جلایا، گرایا، برباد کیا، امت عربیہ اور اسلامیہ کا اجتماعی ضمیر ہمیشہ یہودیوں سے ہر طرح کے مقابلہ کو دینی حمیت اور شرعی اور وطنی ضرورت سمجھتا رہا، کئی جنگیں ہوئیں، ۱۹۴۸ء کی جنگ، ۱۹۶۷ء کی جنگ ۱۹۷۳ء کی جنگ عرب دنیا اور اسلامی دنیا متحد رہی، پھر منافقت کا دور شروع ہوا، حکومتوں نے اسرائیل کو تسلیم کرنا شروع کیا، امریکہ نے اپنی خدائی پر مسلم حکمرانوں سے بیعت لی، امریکہ کے نیاز مندوں نے آداب اطاعت بجالائے، اس پوری مدت میں اسرائیل نے منہ چڑے غلام کی طرح امریکہ اور اقوام متحدہ کی کسی بات کو تسلیم نہیں کیا، رفتہ رفتہ مسلم آبادی سمٹتی چلی گئی، لوگ بھگائے گئے، نکالے گئے، عرصۂ حیات تنگ کیا گیا، مایوسوں کی نا ختم ہونے والے سلسلے نے فلسطینی قوم کو یقین دلایا کہ مزاحمت ہی حل ہے، مقابلہ کیا جائے گا، لڑا جائے گا اور یہی آزادی کا واحد راستہ ہے۔

۱۹۸۷ء میں حماس قائم ہوئی جس نے آزادی کی مقدس جنگ شروع کی، امید کی شمع روشن کی، عزیمت کے تیل سے اس کو بھڑکایا، خون وجگر سے سینچا، ہر طرح کی قربانیوں کا سودا سر میں سمایا اور اب تک میدان میں ڈٹے ہوئے ہیں۔

۷/اکتوبر ۲۰۲۳ء کو انہیں سرفروشوں نے حیرت ناک جرأت، ہمت اور فدائیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی عسکری طاقت سے اسرائیل اور تمام ظالم طاقتوں کے ہوش اڑا دئے، دنیا حیرت زدہ ہے، عقل محو تماشائے لب بام ہے، امت کے اس یقین میں اضافہ ہو گیا کہ مقابلہ ہی آزادی کا واحد راستہ ہے۔

ہماری ذمہ داریاں:

اس موضوع پر سب سے اہم سوال یہ ہے کہ امت کیا کرے؟ کیا امت کے بس میں کچھ نہیں ہے؟ کیا امت کا کردار دعا سے آگے کچھ نہیں ہے؟

یہ بہت اہم سوال ہے اس کا جواب بھی بہت واضح ہے، جواب یہ ہے کہ امت مسلمہ بہت کچھ کر سکتی ہے آج جنگ صرف میدانوں میں نہیں لڑی جا سکتی آج جنگ معاشیات کی بھی ہے، جنگ میڈیا کی بھی ہے، جنگ نظریات کی بھی ہے، جنگ زبان اور قلم کی بھی ہے، یہ تمام جنگ کی صورتیں ہیں، دیکھا جائے تو امت کے لیے اس مقدس فریضہ میں شرکت کے بہت سے مواقع ہیں تھوڑی سی توجہ کی ضرورت ہے، ایمانی غیرت کو جھنجوڑنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا کام یہ ہے کہ ہر مسلمان اس مسئلہ کو تفصیلات کے ساتھ سمجھے، مسئلہ کی اہمیت کے ساتھ فلسطینی جہاد کی شرعی اہمیت کو جانے، اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ کسی بھی اسلامی سرزمین پر کوئی ظالم قابض ہو جائے تو پوری امت پر جہاد فرض ہو جاتا ہے، اگر اس علاقہ کے باشندے کمزور ہوں، تو پوری امت پر یہ ذمہ داری ہے کہ ظالم کا مقابلہ کرے اور اسے اپنی سرزمین سے بے دخل کرے، اسی فریضہ کی وجہ سے ہر ملک میں آزادی کی جنگ لڑی گئی اور دشمنوں کو باہر نکالا گیا اور فلسطین کی زمین تو قبلہ اول ہے، نبی ﷺ کی معراج کی یادگار ہے اور وہاں جو ظلم وبربریت کا مظاہرہ ہو رہا ہے اس کا تصور بھی رونگٹے کھڑے کرنے والا ہے۔

دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ جو مجاہدین وہاں مقابلہ کر رہے ہیں جان و مال سے ان کی مدد

کرنا فرض ہے، وہاں صورت حال نا قابل بیان ہے، لہذا ان تک اپنی مدد پہونچانا اور اس کے لیے کوشش کرنا فرض ہے۔

تیسری ذمہ داری یہ ہے کہ جو لوگ بز دلی کا مظاہرہ کررہے ہیں یا فلسطین کو اسرائیل کے تسلیم کرنے کی بات کررہے، ان کی مخالفت کرنا اور ان کو اکسپوز کرنا بھی ضروری ہے، ایک اہم ترین ذمہ داری یہ ہے کہ اسرائیلی مصنوعات اور اسرائیل کو مدد کرنے والی کمپنیوں کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے اسرائیلی مصنوعات آج گھر گھر پہونچ چکی ہیں، ہر بنیادی ضرورت کی چیزوں میں اسرائیلی مصنوعات نظر آرہی ہیں، اس سلسلہ میں ہمارا نظریہ یہ ہونا چاہیے کہ ہم کوالٹی پر سمجھوتہ کرلیں گے مگر اپنے بھائی اور بہنوں کے خون کا سمجھوتہ نہیں کریں گے، عورتوں کو اس سلسلہ میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے، بائیکاٹ کی لہر نے کئی اسرائیلی کمپنیوں کی کمر توڑ دی ہے، اس تعلق سے ہمیں مکمل اطمینان اور اعتماد کے ساتھ اس مہم میں حصہ لینا چاہیے۔ آخری بات یہ ہے کہ دعا کی اپنی اہمت ہے اس کا بھی خوب اہتمام کرنا چاہیے، یقین کرنا چاہیے کہ فتح کا سورج ضرور طلوع ہوگا، اپنی تابانیوں کے ساتھ طلوع ہوگا، وہ ظلم و جبر کی تاریکیوں کو مٹا دے گا، اس دن اہل ایمان خوش ہوں گے اور ظالم و جابر لوگ حسرت اور افسوس کرتے رہ جائیں گے انشاء اللہ۔

اعلان برائے ایصال ثواب

تعلیمی وملی بورڈ بھاگلپور کے سرپرست محترم حضرت مولانا انصار صاحب کی اہلیہ محترمہ کا ۲۶ رنومبر ۲۰۲۳ء بروز اتوار طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا انا للہ و انا الیہ راجعون

اسی طرح تعلیمی وملی بورڈ کے موقر رکن حضرت مولانا مفتی اعزاز انور صاحب کے چچا جناب محمد سراج صاحب کا ۶ ردسمبر رات ایک بجے انتقال ہوگیا انا للہ و انا الیہ راجعون،

تعلیمی وملی بورڈ کے اراکین دونوں حضرات سے اظہار تعزیت کرتے ہیں اور آپ تمام قارئین سے ان دونوں کے لیے ایصال ثواب کی درخواست کرتے ہیں۔

سیرت وسوانح

مجددالف ثانی اور تجدیدی کارنامے

غلام مصطفی

متعلم دارالعلوم وقف دیوبند

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہر صدی کے سرے اللہ تعالیٰ ایک مجدد مبعوث فرمائے گا جو اپنے کارناموں سے دین کی تجدید فرمائے گا، تمام اہل نظر وانصاف پسند حضرات کا اس بات پر اتفاق ہے کہ گیارہویں صدی کے مجدد ''حضرت شیخ احمد سرہندی'' ہیں۔

ابتدائی حالات: آپ کا نام احمد، لقب بدرالدین، کنیت ابوالبرکات اور عرف امام ربانی تھا، مذہب کے حنفی تھے، آپ کی ولادت باسعادت ۱۴ شوال ۹۷۱ھ مطابق ۱۵۶۳ء میں ہوئی، جائے پیدائش شہر سرہند پنجاب ہے، آپ کا شجر نسب حضرت امیر المومنین عمر بن الخطاب ؓ سے ملتا ہے، آپ کے والد ماجد شیخ عبدالاحد ایک بلند پایہ عالم دین اور عظیم المرتبت صوفی تھے، آپ نے زیادہ تر علوم اپنے والد بزرگوار سے اور کچھ علوم اس زمانے کے بعض مشہور علما سے حاصل کئے، ۱۷ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے، پھر درس وتدریس میں مشغول ہو گئے اور عربی وفارسی میں کچھ رسائل بھی لکھے جن میں ''رسالہ تہلیلیہ'' اور ''ردروافض'' شامل ہے۔

جس ماحول اور عہد میں حضرت مجدد کو اپنا نازک ودشوار تجدیدی کارنامہ انجام دینا تھا وہ تصوف کا ماحول تھا، لوگ کسی عالم اور مصلح کے اس وقت تک قائل نہیں ہوتے تھے؛ جب تک وہ تصوف سے آشنا نہ ہو اور مشائخ کے صحبت یافتہ نہ ہو، لہذا اس میدان انقلاب اور اصلاح میں اترنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے شیخ احمد سرہندی کو تصوف وسلوک کا نہ صرف محرم راز بنایا؛ بلکہ ان کو درجہ امامت واجتہاد تک پہنچایا۔

ابتداءً آپ نے اپنے والد بزرگوار سے طریقہ چشتیہ اور قادریہ میں بیعت کی، ایک مرتبہ

مجدد الف ثانی کے سامنے حضرت خواجہ باقی باللہ کے علوم مرتبہ اور قوت باطنی کا تذکرہ آیا، جو کچھ ہی عرصہ قبل خواجہ امکنگی قدس سرہ کے حکم پر دہلی تشریف لائے تھے، حضرت مجدد کو ملاقات کا شوق ہوا اور مولانا حسن کشمیری کے ساتھ ملاقات کے لیے گئے، وہاں کچھ عرصہ مقیم رہے اور طریقہ نقشبندیہ کی تحصیل کی، اس کے بعد سرہند جا کر ارشاد و ہدایت کا کام شروع کیا اور بہت سے خلفاء کو تبلیغ کے لیے مختلف مقامات پر بھیجا، حتی کہ آپ کے خلفاء ماوراء النہر، بدخشاں، کابل اور بعض عرب ممالک یمن، شام اور روم تک پھیل گیے ۔

تجدیدی کارنامے: حضرت مجدد صاحب کے بہت سے تجدیدی کارنامے ہیں، آپ نے شیعیت کی زوردار مخالفت کی، بدعات کی کھلی ہوئی تردید کی، حتی کہ بدعت حسنہ کے وجود سے بھی انکار کیا اور ایران کے اس نقطوی تحریک کا بھی سد باب کیا، جنھوں نے یہ اعلان کیا تھا کہ ''نبوت محمدی کا ایک ہزار رسالہ دور ختم ہوا، اب دینی رہنمائی اور زندگی کی تشکیل جدید طریقے (عقلیت اور فلسفہ) پر ہوگی۔

دین اکبری: لیکن شیخ سرہندی کا اصل اور ہمہ گیر تجدیدی کارنامہ وہ ہے جس کی وجہ سے جہانگیر کی جہانگیری کو بھی آپ کے سامنے سرخم تسلیم کرنا پڑا، آپ نے سلطنت کا رخ موڑ دیا اور وہ انقلاب برپا کیا جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

امام ربانی کی ولادت سے آٹھ سال پہلے ۹۶۳ھ میں ''اکبر بادشاہ'' تخت نشیں ہوا، اس نے طاقت وقوت اور کچھ مولوی نما گمراہ درباریوں کے ذریعہ اسلام پر خط تنسیخ کھینچ دی، اکبر نے اسلام کو سرکاری طور پر منسوخ کر کے ''دین اکبری'' یا ''دین الٰہی'' کے نام سے ایک نیا دین ایجاد کیا، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دیگر شعائر دین منسوخ کر دیا، جنت وجہنم کا انکار کیا، ایک نیا کلمہ ''لا الہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ'' گھڑا گیا، خنزیر، شراب نوشی اور سودخوری کو حلال قرار دیا گیا، زنا کو حکومتی سر پرستی دی گئی؛ الغرض اسلامی شعائر کو منسوخ کر کے ہر لہولعب کو حکومتی طور پر رواج دیا گیا۔

جہانگیر کی جانشینی: ۱۰۱۴ھ میں اکبر کی وفات ہوئی اور اس کا بیٹا تخت نشیں ہوا، امام ربانی کی عمر اس وقت ۴۳ سال تھی، جہانگیر کی جانشینی عمل میں آئی تو عرصہ تک عہد اکبر کے رسوم وآئین جاری رہے، لیکن زیادہ دن تک یہ صورت حال باقی نہیں رہی، جب جہانگیر کا میلان شریعت محمدی کی تعلیم اور احترام کی طرف ہوا تو حضرت مجدد نے سمجھ لیا کہ اب سلطنت کے رخ بدلنے اور تدریجی

طور پر اس کو راہ راست پر لانے کا وقت آ گیا ہے، آپ نے تجدیدی کام کا آغاز فرمایا اور دربار میں موجود بااثر شخصیات کو خطوط لکھ کر مکمل ان کو اسلام کی طرف راغب کیا؛ لیکن قبل اس کے کہ آپ حکومت پر بہت اثر انداز ہوں، گوالیار کے اسیری کا واقعہ پیش آ گیا، واقعہ یہ ہے کہ جب آپ کو جہانگیر بادشاہ نے اپنے مستقر پر طلب کیا اور آپ دربار پر تشریف لائے تو آداب شاہی ''سجدہ تعظیمی'' جو خلاف شرع تھا بجالانے سے انکار کر دیا، بادشاہ نے وجہ دریافت کی آپ نے فرمایا : میں نے آج تک خدا اور رسول کے بتائے ہوئے آداب واحکام کی پابندی کی ہے، اس کے علاوہ مجھے کوئی آداب نہیں آتے ، بادشاہ نے ناراض ہو کر کہا مجھے سجدہ کرو! آپ نے فرمایا: میں نے سوائے خدا کے کسی کو نہ سجدہ کیا ہے اور نہ کروں گا، بادشاہ اس پر ناراض ہوا اور گوالیار کے قلع میں نظر بند کر دیا۔

آپ نے زندان میں سنت یوسفی کو زندہ کیا اور دعوت وتبلیغ اور ارشاد و ہدایت کا کام وہیں سے شروع کر دیا، کئی ہزار قیدی جو غیر مسلم تھے، آپ کے فیض سے مشرف بہ اسلام ہوئے اور سیکڑوں قیدی درجات عالیہ تک پہنچ گئے، حضرت مجدد صاحب ایک سال قلعہ گوالیار میں رہے، جب جہانگیر بادشاہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو آپ کو رہا کر دیا، باہر آنے کے بعد بادشاہ نے آپ کا بہت اکرام کیا اور کہا: چاہیں تو آپ سرہند تشریف لے جائیں یا لشکر کے ساتھ کچھ دن قیام کریں، چوں کہ ابھی تجدیدی مشن مکمل نہیں ہوا تھا؛ اس لیے آپ نے وہیں قیام کیا، یہاں سے آپ نے تجدید کا وہ کارنامہ انجام دیا، جس نے وزراء، بادشاہ، لشکر اور پورے ہندوستان کی تصویر بدل دی، دین اکبری کو منسوخ کر دیا گیا اور ہندوستان پھر برہمنیت کے گود میں جانے کے بجائے ایک بار پھر محمد عربی ﷺ اور دین حجازی کی تولیت اور نگرانی میں آ گیا، علامہ اقبال نے اپنے اس مشہور شعر میں اسی طرف اشارہ کیا تھا۔

وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان　　　　اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

وحدۃ الوجود یا وحدۃ الشہود:

حضرت مجدد الف ثانی کا دوسرا بڑا تجدیدی کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے وحدۃ الوجود کے عقیدہ ونظریہ پر اتنی سخت ضرب لگائی جو اس سے پہلے کسی نے نہیں لگائی تھی، اس ذوق اور مسلک

کے مجدد اور علمی طور پر بانی وموسس ''شیخ محی الدین بن علی ہیں جو''شیخ اکبر'' کے نام سے مشہور ہیں، ہندوستان اس کا قدیم ترین اور روشن ترین قائل وداعی تھا، مشائخ چشتیہ میں ایک بڑی تعداد اس مشرب کے حامی اور داعی تھے، اس عقیدے کے خلاف لب کشائی کرنا گویا جہالت کا ثبوت دینا تھا، لیکن آپ نے شیخ اکبر سے اختلاف کیا اور وحدۃ الوجود کے کے متوازی وحدۃ الشہود کا نظریہ پیش کیا، اس طرح حضرت مجدد نے وحدۃ الوجود کی نفی اور شیخ اکبر کے علو مقام اور عنداللہ مقبولیت کا انکار کیے بغیر ایک نئی چیز کا اضافہ کیا، جس سے اس عقیدہ کی اصلاح بھی ہوگئی اور وحدۃ الوجود کے ماننے والے کی ناراضگی سے بھی بچ گئے۔

الغرض اللہ نے امام ربانی مجدد الف ثانی سے ہند و بیرون ہند میں حمایت دین، اقامت سنت اور ازالہ بدعت کا وہ تجدیدی کام لیا جو شاید اس سے قبل کسی سے لیا ہو، یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ نے آپ کو نہ صرف سو سال کا بلکہ ''ہزارۂ دوم'' کا مجدد تسلیم کیا ہے اور ''الف ثانی'' کا لقب دیا ہے، بارہویں صدی کے مجدد حجۃ اللہ فی الارض شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ امام عارف عالم مولانا شیخ احمد فاروقی، ماتریدی، حنفی، نقشبندی سرہندی کے اہل ہند کے گردن پر بہت سے احسانات ہیں، جن کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔

سیرت وسوانح

نانی محترمہ — رحمتوں کے سایے میں

اہلیہ محترمہ حضرت مولانا انصار صاحب دامت برکاتہم

مفتی عمار احمد قاسمی

استاذ دار العلوم حیدرآباد

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتام زندگی
ہے یہ شام زنگی صبحِ دوام زندگی

۱۱/ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۵ھ مطابق ۲۶/ نومبر ۲۰۲۳ء کو اتوار کی شب تقریباً ۲/ بجے نانی محترمہ اللہ کو پیاری ہوگئی، یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر شئ اس دنیا میں متعین مدت تک کے لیے وجود میں آئی ہے، اور اپنی متعین مدت کی تکمیل کے بعد فنا ہو جاتی ہے، دنیا کی کوئی طاقت اس نظام میں خلل نہیں ڈال سکتی، کل نفس ذائقة الموت۔ ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہے، یعنی جو بھی مخلوق اس دنیا میں پیدا ہوتی ہے یا ہوگی، اُسے اپنی حیاتِ مستعار کی میعاد پوری کر کے موت سے دو چار ہونا ہے، دنیا اپنی تمام تر وسعتوں اور اُس میں بے شمار انسانوں کی تخلیق کے سبب کوئی ایسا دن نہیں گزرتا ہے جس دن کسی انسان کی موت یا پیدائش نہ ہوتی ہو، ہر آن، ہر لمحہ اَموات کا سلسلہ جاری ہے، کوئی تو اپنی طبعی موت مرتا ہے، تو کوئی کسی حادثہ کا شکار ہو کر اِس دنیا سے چلا جاتا ہے، کوئی جوانی میں داغِ مفارقت دے جاتا ہے، تو کوئی بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ کر موت کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے؛ لیکن چند لوگ ایسے ہیں جن کا عالم بالا کی طرف انتقال نہ صرف ایک کنبہ، خاندان، گاؤں، محلہ بلکہ پورے عالم کے لیے خسارے کا باعث ہوتا ہے، پیاری نانی کے دنیا سے تشریف لے جانے سے بے حد رنج وغم اور افسوس ہے، کیوں کہ ایک اچھے صالح معاشرہ اور افراد کے لیے فائدہ مند خواتین کی وفات پر رنج وغم اور افسوس کا ہونا ایک فطری عمل ہے، مرحومہ ایک

لمبے عرصہ سے بیمار تھیں،لیکن ہر مرتبہ اللہ کے فضل وکرم سے روبصحت ہوجاتیں،اس مرتبہ جب بقرعید کے بعد وطن سے حیدرآباد واپس آئیں،تو مرحومہ کی جو طبیعت بگڑی تو بگڑتی ہی چلی گئی، بالآخر ایک طویل علالت کے بعد ہم سب کو الوداع کہہ کر اپنے رب رحیم کی نعمتوں اور اس کی رحمتوں کے سایے میں ہمیشہ ہمیش کے لیے چلی گئیں،**اناللہ وانا الیہ راجعون.**

ابتدائی حالات اور شادی خانہ آبادی:

مرحومہ کا تعلق ایک دیندار گھرانے سے تھاان کی پیدائش چمپانگر کے محلہ بھرولال لین میں ہوئی،والدمحترم جناب حاجی عبدالرؤف صاحب دینی مزاج کے حامل تھےاور حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی سے بیعت تھے،حضرت امیر شریعت عام طور پر آپ کے گھر پر ہی قیام کرتے تھے ،مرحومہ کا عقد نکاح ملک کے ممتاز محدث نمونۂ اسلاف تلمیذ شیخ الاسلام حضرت مولانا انصار صاحب دامت برکاتہم شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ دارالعلوم حیدرآباد کے ساتھ ۲۲ رشوال ۱۳۷۸ھ مطابق یکم فروری ۱۹۵۹ء کوہوااور نکاح مولانا منت اللہ صاحب رحمانی نوراللہ مرقدہٗ نے پڑھایا۔

مرحومہ کا ذوقِ عبادت:

مرحومہ صوم وصلوٰۃ کی پابند،تہجد گذار خاتون تھیں،عبادت کا اتنا زیادہ شوق تھا کہ اپنے دن ورات کا اکثر حصہ عبادتِ الٰہی میں گزارتیں،اور اپنے آپ کو اُن اعمال میں لگاتیں جو خدا اور اس کے رسول کو راضی کرنے والے ہوتے،اللہ سے ڈرنے والی تھیں،چاشت کی نماز پابندی سے ادا کرنے والی تھیں،رمضان المبارک میں تراویح کا خاص اہتمام کرتی تھیں،جہاں اَوامر کی بے حد پابندی تھی وہیں نواہی سے بچنے کا بھی خوب التزام کرتی تھیں،خوفِ الٰہی سے ہر وقت لرزاں اور ترساں رہتی تھیں،حق گو اور رونے والی تھیں،زبان پر ہمیشہ اللہ کا ذکر جاری رہتا تھا،غرضیکہ احکام کی تعمیل اور اس کی رضا جوئی اور سنتِ نبوی کی پیروی اُن کے رگ وریشے میں سما گئی تھیں۔

اَخلاق واَوصاف:

مرحومہ ایک نیک سیرت خاتون ہونے کے ساتھ بلنداَخلاق،باکردار شخصیت کی مالک تھیں،سماجی طور پر غریب مستحق بے سہارا افراد کے ساتھ ہمدردی اور مالی تعاون کرنے کے لیے ہمیشہ پیش پیش رہتی تھیں۔

جب کوئی رشتہ دار یا شناسا اُن کے گھر جاتا تو خندہ پیشانی سے اُن کا استقبال کرتی تھیں، خاندان کا ہر فرد اُن سے محبت رکھتا تھا، ضیافت ومہمان نوازی میں بھی پیش پیش رہا کرتی تھیں، زبان سے اُن کی کوئی شکایت نہیں سنی گئی۔

صبر وشکر کی صفت بھی کوٹ کوٹ کر بھری تھی، ہر چھوٹی بڑی چیز پر شکر یہ ادا کرنا مرحومہ کا طرۂ امتیاز تھا، مرحومہ کی کوئی اولاد نہیں تھی لیکن کبھی شکوہ وشکایت زبان پر نہیں لاتی تھیں، اس طرح وہ صابرین وشاکرین میں سے تھیں۔

صفائی وپاکیزگی:

مرحومہ میں ایک خاص وصف صفائی وستھرائی تھی، حتی کہ دانتوں کی صفائی میں مسواک کا خوب اہتمام کرتی تھیں، اور اپنی نفاستِ طبع کی وجہ سے ہر چیز کو صاف ستھرا اور پاک رکھتی تھیں، طہارت ونظافت ایک مہتم بالشان عمل ہے۔

مرحومہ میں ایک دوسری خاص صفت معاملات کی صفائی تھی، جب بھی کسی سے کوئی چیز منگواتی تو فورا پیسے دے دیا کرتی تھیں، ہمیشہ معاملات کو صاف رکھتی تھیں، آج کل اگر دیکھا جائے تو معمولات میں تو ہم بہت آگے ہیں جب کہ معاملات میں بہت پیچھے ہیں، ہمارے سماج میں آپس کی رنجشوں، نفرتوں، جھگڑوں اور تنازعات کا جو سلسلہ چل رہا ہے اُن کی تہہ میں اگر دیکھا جائے تو ان کے اَسباب میں سے بنیادی سبب معاملات میں پیچھے رہنا ہے (اللہ ہماری حفاظت فرمائے) اور مرحومہ کی اس صفت کو اپنے اندر پیدا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

بیعت وسلوک:

مرحومہ اپنی اِصلاح اور تزکیۂ نفس کے لیے ایک کامل متبع شریعت حضرت مولانا رحم الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں بیعت ہوئیں اور اُنہی کے بتائے ہوئے اَوراد وظائف پر تادمِ حیات کار بند رہیں، مولانا رحم الٰہی رحمۃ اللہ علیہ دار العلوم دیو بند کے استاذ، مایہ ناز عالم دین، پیکرِ علم وعمل، زاہد وعابد، جواد اور ہر دل عزیز شخص تھے، آپ کی کاملیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کے شیخ کا نام بھی مولانا رحم الٰہی رحمۃ اللہ علیہ ہے، اور ان کے شیخ کا نام شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ ہے، اور شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ، حافظ ضامن شہیدؒ اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ یہ تینوں بیعت تھے میاں جی نور محمد جھنجھانویؒ سے، اِس سے مرحومہ کے عالی، بیعت وسلوک کا پتہ چلتا ہے۔

مقالات ومضامین

پلا پٹی (تمل ناڈو) کا سہ روزہ سفر اور اسلامک فقہ اکیڈمی کا بتیسواں سیمینار

مفتی امانت علی قاسمی
استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کا بتیسواں سہ روزہ سیمینار منعقدہ ۱۸-۲۰ نومبر ۲۰۲۳ء کے لیے علم و فقہ کا قافلہ تمل ناڈو کے شہر پلا پٹی کے معروف ادارہ ''جامعۃ الاسوۃ الحسنۃ، کلیۃ الشریعۃ'' کے احاطہ میں خیمہ زن ہوا تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کوئی ''فقہی میلہ'' لگا ہو، پورے ملک کے نمائندہ مفتیان کرام، بڑی جامعات کے اساتذہ، تنظیموں کے علمی اراکین سب جمع تھے، شہر کے کنارے جنگل میں قائم جامعہ میں علماء وصلحاء کا اجتماع واقعی دلکش نظارہ پیش کر رہا تھا، شہر کے لوگوں کا یہ نصیب تھا کہ ان کے یہاں علماء وفقہاء کی اتنی بڑی تعداد جمع تھی جو بظاہر کسی بڑے سے بڑے اجلاس میں بھی جمع نہیں ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پورے شہر؛ بلکہ پورے صوبہ نے اس کی میز بانی کو اپنا فریضہ تصور کیا تھا اور میز بانی کا پورا حق ادا کیا تھا۔ عوام وخواص، طلباء وعلماء ہر کوئی ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ بچھے جا رہے ہیں اور ضیافت میں کسی کمی کے لیے کسی طرح تیار نہیں ہیں، سو میٹر کی دوری پر واقع قیام گاہوں کے لیے ہر وقت گاڑی دستیاب ہوتی اور اتنی مقدار میں کہ اگر دو سو لوگوں کو بھی الگ الگ گاڑیوں میں جانا ہو تو سب کے لیے بآسانی نظم تھا۔

پلّا پٹی:

یہ پروگرام پلا پٹی میں منعقد ہوا تھا، پلا پٹی ضلع کرور تمل ناڈو کا ایک چھوٹا شہر ہے، یہ قصبہ،

کرور کے جنوب سے ۳۵ کلومیٹر، ڈینڈیگل کے شمال سے ۵۰ کلومیٹر اور پالانی کے جنوب مغرب سے ۶۸ کلومیٹر پر واقع ہے۔ کرور ضلع کے تین میونسپلٹی میں ایک پلاّ پٹی ہے۔ تمل ناڈو کے چار بڑے شہر ہیں، چنئی، مدورئی، کوئمبٹور اور ترچی، چاروں جگہ ایر پورٹ ہے، چنئی کے علاوہ باقی تینوں شہر سے پلا پٹی کا فاصلہ قریب ایک سو بیس کلومیٹر کا ہے۔ یہ شہر چھوٹی سے ندی کے کنارے پر واقع ہے جس سے اس شہر کی شادابی قائم ہے، ہر جگہ ہریالی دکھائی دیتی ہے، کہا جاتا ہے کہ اس شہر میں شیخ بابا فخر الدین ایران سے آئے تھے اور اس علاقے میں مقیم ہوتے تھے، یہاں انہوں نے دعوت و تبلیغ کی محنت کی جس کے نتیجے میں پورا شہر مشرف باسلام ہوگیا۔ پچاس ہزار سے زائد کی آبادی کی اس میونسپلٹی میں مکمل طور پر مسلمان آباد ہیں۔ اس شہر کی کئی اہم خصوصیات ہیں جس نے وہاں جانے والے تمام ہی مہمانوں کو بہت متاثر کیا۔ پورے پلا پٹی کے علاقے میں مسلمان ٹوپی پہن کر رہتے ہیں اگر کوئی پلاّ پٹی سے باہر جائے تو وہ ٹوپی اتار بھی سکتا ہے؛ لیکن اس شہر میں داخل ہوتے ہی واپس ٹوپی پہن لیتا ہے، آپ وہاں کسی کو بلا ٹوپی نہیں دیکھیں گے۔ خواتین میں سو فیصد برقع کا رواج ہے، اس پورے میونسپلٹی میں کوئی شراب خانہ، تھیٹر اور پولیس اسٹیشن نہیں ہے۔ شادی میں عام طور پر سادگی کو ملحوظ رکھتے ہیں، آبادی میں مسلمان دیوبندی اور بریلوی دونوں حلقے کے لوگ ہیں، لیکن ان سب کی عیدگاہ ایک ہے اور قبرستان بھی مشترک ہے۔

وہاں آزادی سے پہلے لوگوں میں سود کا بہت رواج تھا اور عام طور پر لوگ سود میں مبتلا تھے؛ لیکن تبلیغی جماعت کی محنت سے وہاں پر تبدیلی آئی، دینی رجحانات پیدا ہوئے اور انہوں نے سودی کاروبار کو ترک کر دیا۔

جامعۃ الاسوۃ الحسنۃ (پلا پٹی):

وہاں ایک بڑا مدرسہ ہے جس کا نام ''جامعۃ الاسوۃ الحسنۃ'' ہے یہ ادارہ واقعی وہاں کے لوگوں کے لیے اسوۃ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ اس مدرسہ اور اس کے بانی کی توجہات سے اس علاقے میں دین کا ایک اچھا ماحول قائم ہوا ہے۔ اس علاقے کے بارے میں ایک عام بات یہ تھی کہ یہاں پہلے لوگ سودی کاروبار میں مبتلا تھے اور یہ عمومی فضا بن گئی تھی لیکن ''الاسوۃ الحسنۃ'' کے سابق مہتمم مولانا عبدالرحیم صاحب الرشادی، القاسمی کی محنت اور دعوتی جد جہد کے بعد وہاں سے

یہ ماحول نہ صرف ختم ہوگیا؛ بلکہ ان لوگوں کا یہ سوال تھا کہ ہمارے آباء واجداد مال حرام میں مبتلا تھے، اب ہمیں جو جائداد وراثت میں ملی ہے اس کا کیا حکم ہے؟ اس مال حرام سے جو ہم نے کاروبار کیا اس کی نفع اور آمدنی کا کیا حکم؟ ایسے لوگوں کے یہاں دعوت کھانا یا ہدیہ قبول کرنا کیسا ہے؟ اگر رشتہ دار ہوں اور شادی وغیرہ میں شریک ہونا پڑے تو کیا حکم ہے؟ اگر کھانے کے بعد معلوم ہوا کہ جو مال ہم نے کھایا وہ حرام تھا تو اب تلافی کی کیا صورت ہے؟ اس طرح کے سوالات خود ان لوگوں نے مرتب کئے تھے، جو کہ سمینار کا ایک موضوع تھا۔ اس سے ان لوگوں کی دینی ذمہ داری اور احساس ذمہ داری کا پتہ چلتا ہے۔ الاسوۃ الحسنۃ کا قیام ۱۹۹۱ء میں عمل میں آیا، یہ ادارہ فیس کے نظام سے مربوط ہے، ایک طالب علم کی فیس تین ہزار روپیے ہے۔ انہوں نے مدرسہ کے ساتھ عصری تعلیم کا معیاری اسکول ''الاسوۃ الحسنۃ انٹرنیشنل اسکول'' کے نام سے قائم کیا ہے، اسی طرح لڑکیوں کے لیے ''الاسوۃ الحسنۃ شریعت گرل کالج''، اور شریعت گرلس اسکول بھی قائم کیا، جہاں غیر مخلوط طریقے سے لڑکے لڑکیوں کی معیاری عصری تعلیم کا نظم ہے۔

ادارہ اور وہاں کے لوگوں کو دیکھ کر دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ دعوت وتبلیغ اس امت کی روح ہے اور جب تک یہ امت دعوت کی محنت سے جڑی رہے گی اس امت کی تربیت ہوتی رہے گی اور دینی معیار بلند ہوتا رہے گا اور جب امت سے تبلیغ کی یہ محنت ختم ہوجائے گی تو امت دینی وتربیتی لحاظ سے مفلوج ہوجائے گی۔ یہاں ابتداء میں ایران سے آئے بزرگ نے دعوت کی محنت کی، بعد میں تبلیغی نظام سے جڑ کر مولانا عبد الرحیم کے والد مولانا عبد الحئی صاحب نے محنت کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس علاقے میں لوگوں میں دینی شعور زندہ ہے، علماء کا احترام ہے ،لوگ تین ہزار روپیے فیس دے کر اپنے بچوں کو دینی تعلیم دلا رہے ہیں۔ دعوت کسی نہج پر بھی ہو اس کی محنت اس امت کا بنیادی فریضہ ہے۔ دعوت کی محنت سے نہ صرف یہ کہ دین پھیلتا ہے بلکہ خود دین پر استقامت نصیب ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اگر اجتماعی نظام اور قومی مفاد کو ترجیح دی جائے تو قومیں ہر حال میں عروج کی طرف گامزن ہوتی ہیں اور جس قوم کے صف اول کے لوگوں میں انفرادی مفادات کی ترجیح شامل ہوجائے، اس قوم کے زوال کو کوئی نہیں روک سکتا ہے۔ اس لیے ہمیشہ قومی مفادات کا خیال ہونا چاہیے نہ کہ اپنے ذاتی مفادات کی ترجیح پیش نظر ہونی چاہیے۔

تمل ناڈو میں دینی تعلیم:

پروگرام کے افتتاحی نشست میں الاسوۃ الحسنۃ کے ذمہ دار جناب مولانا زکریا صاحب نے مہمانوں کا استقبال کیا اور تاریخی معلومات فراہم کرنے والا جامع خطبہ استقبالیہ پیش کیا اس میں انہوں نے تمل ناڈو کی دینی تعلیم کی صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ یہاں 7.2% مسلمان ہیں، چارسو دینی اقامتی مدارس ہیں، لڑکیوں کی دینی تعلیم کے لیے بھی بھرپور کوشش ہو رہی ہے، ایک تنظیم تائی نسوان مدارس کی ہے جس کے تحت ۶۰۰ نسواں کے مدارس کام کررہے ہیں، اسی طرح ایک تنظیم یونس الحرمین حاجی رفیق کی ہے، جس کے تحت ۵۵۰ مدارس البنات ہیں اس کے علاوہ بھی بہت سے بڑے اور چھوٹے نسواں کے مدارس اور تنظیمیں کام کررہی ہیں۔ سرکاری اعداد وشمار کے مطابق چھ سال کی عمر کے سات لاکھ بچے ہیں اور ۱۵ سال سے کم عمر کے سولہ لاکھ بچے ہیں، ان کی دینی تعلیم کے لیے مختلف مکاتب کے ادارے کام کررہے ہیں، صرف دینیات کے نصاب کے تحت ۴ لاکھ بچے تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ اس مختصر سے بیانیے سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ صوبہ تمل ناڈو کے مسلمان دینی تعلیم کے حوالے سے کس قدر بیدار ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے بچوں کو مسلمان رکھنے کے لیے انہیں دینی تعلیم سے آراستہ کرنا کس قدر ضروری ہے، دوسرے صوبوں کے مسلمانوں اور وہاں کی تنظیموں کو اس اسوۂ حسنہ کو اختیار کرنا چاہیے اور موجودہ ماحول میں جب کہ حکومتی سرپرستی میں بچوں کو دین سے دور رکھنے کی کوشش ہو رہی ہے، تمل ناڈو کے مسلمانوں کی کوششیں قابل قدر ہیں اور یقینا اگر ہم بیدار ہو گئے تو کوئی بھی ہم سے ہماری متاع عزیز کو نہیں چھین سکتا ہے؛ بلکہ ہم اس گنجہائے گراں مایہ سے پوری دنیا کو فیض یاب کرسکتے ہیں۔

اسلامک فقہ اکیڈمی کا ۳۲واں سیمینار:

اسلامک فقہ اکیڈمی کا ۳۲واں سیمینار تین موضوعات پر مشتمل تھا (۱) مال حرام سے متعلق بعض مسائل (۲) تشبہ سے متعلق مسائل (۳) سرمایہ کاری کے بعض نئے مسائل، اس کی میزبانی کا شرف تمل ناڈو اور خاص کر پلاپٹی کے مسلمانوں کو حاصل ہوا۔ پروگرام انتظام وانصرام کے اعتبار سے، قیام وسہولیات کے اعتبار سے قابل تحسین تھا، واقعی وہاں کے مسلمانوں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا اور خوب سے خوب تر کیا تھا۔ اسلامک فقہ اکیڈمی کے روح رواں اور علم وفقہ کے قافلہ کے

سالار حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب تمام نشستوں میں برابر شریک رہے اور مناقشہ کے دوران لوگوں کے سوالات کے جوابات بھی وقتاً فوقتاً دیتے رہے، اسلامک فقہ اکیڈمی کے نائب صدر حضرت مولانا سفیان صاحب قاسمی، مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند نے آخری نشست میں شرکت فرمائی اور صدارتی خطاب پیش کیا جس میں آپ نے سوشل میڈیا کو ہدف بنا کر اسلامی اور فقہی احکام کو عام کرنے کے کام پر زور دیا اور فضلاء مدارس کو زمانہ شناسی اور اسلوب زمانہ سے واقف ہونے کی طرف متوجہ کیا۔اس پروگرام میں جو تین موضوعات تھے اس میں ایک موضوع کی وضاحت اوپر آ چکی ہے۔دوسرا موضوع تشبہ سے متعلق تھا جو موجودہ دور میں کافی اہمیت کا حامل ہے اس لیے کہ اکثریتی فرقے کی طرف سے اس کی کوشش ہو رہی ہے کہ تمام مسلمانوں کو ایک رنگ میں رنگ دیا جائے، مسلمانوں کو ان کے اپنے مذہبی تشخصات سے محروم کر دیا جائے، صرف یہی نہیں؛ بلکہ ان کی پوری کوشش ہے کہ تمام مخالف نظریہ کے حامل لوگوں کو مشرکانہ سوچ میں ضم کر دیا جائے اور تعلیم کے ذریعہ اس کو عملی جامہ پہنانے کی پوری کوشش ہو رہی ہے، نصاب میں تبدیلی، سوریہ نمسکار، یوگا، گیتا کو نصاب میں شامل کرنا، وندے ماترم کا ترانہ، یہ سب اسی تصور کا حصہ ہے۔حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب نے اپنے مطبوعہ کلیدی خطاب میں اس پر بھرپور توجہ دلائی ہے، اس کے لیے آپ نے کثرت سے مکاتب کے قیام، زیادہ سے زیادہ اسکول کھولنے اور مسلمان بچوں کے لیے اعلی امتحانات کی تیاری کے لیے کوچنگ سینٹر کھولنے پر زور دیا ہے؛ اسی طرح سوشل میڈیا کے ذریعہ اسلام کے پیغام کو مثبت انداز میں پیش کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ٹی وی ڈیبیٹ میں جو زہر پھیلایا جا رہا ہے یوٹیوب اور ویڈیوز کے ذریعہ اس کے مسکت جواب دینے کی ضرورت کی طرف متوجہ کیا۔تیسرا موضوع، شیئر مارکٹ اور شرکت کی مختلف صورتوں سے متعلق تھا، موجودہ دور میں کاروبار میں جس قدر تنوع پیدا ہو گیا اور ایک مسلمان کو اس میں جس قدر دشواری پیش آ رہی ہے وہ کسی بیانیے کا محتاج نہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ موجودہ معاشی نظام کا بھرپور مطالعہ کیا جائے اور مسلمانوں کے لیے قابل عمل صورتوں کو واضح کیا جائے تاکہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مسلمان ہر اعتبار سے پستی و پسماندگی کی انتہاء کو پہونچ رہے ہیں ان کے لیے کچھ فلاح و کامیابی کی صورتیں نکل سکیں۔الحمدللہ سیمینار میں تینوں موضوعات پر حضرات علمائے کرام نے کھل کر بحث میں حصہ لیا اور متفقہ طور پر تجاویز منظور کی گئیں۔

آگے بڑھنے کا حوصلہ

مفتی تنظیم عالم قاسمی
استاذ حدیث دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد

پہلے زمانہ کے مسلمان دین کے ساتھ دنیوی اعتبار سے بھی آگے بڑھنے کا ہنر جانتے تھے، محتاجگی اور بے جا قناعت کی زندگی انہیں پسند نہیں تھی، وہ نہیں چاہتے تھے کہ علم و ہنر یا کسی فن میں دوسری قوموں سے پیچھے رہیں، یہی وہ فکر تھی جس کی وجہ سے مستقبل کی تعمیر اور عروج و ترقی کے لیے نئی نئی تدبیریں سوچتے اور عزت کی زندگی کی راہ تلاش کر لیتے تھے۔

فرانسیسی مؤرخ والٹیر نے لکھا ہے کہ پہلی گھڑی جس سے یورپ واقف ہوا وہ مسلم خلیفہ ہارون الرشید کی گھڑی تھی، جو اس نے ۸۰۷ء میں بطور تحفہ فرانس کے بادشاہ شارلیمان کو بھیجی، یورپ کے لیے وہ اس زمانہ میں بالکل نئی چیز تھی، دربار کے لوگوں نے جب اس کو دیکھا تو وہ حیران ہو کر رہ گئے، مگر سترہویں صدی میں جب مشینی دور شروع ہوا اور اسپرنگ کلاک وجود میں آیا تو اس کا موجد یورپ تھا، اب صورت حال بالکل بدلی ہوئی تھی، یورپ کے تاجر اسپرنگ دار گھڑیاں یورپ سے لے آتے اور ہندوستان کے مغل شہزادے اس کو شوق کے ساتھ خریدتے اور کثرت سے استعمال کرتے، یورپ کے حکمرانوں نے بغداد کے مسلم کاریگروں کی بنائی ہوئی گھڑیوں کو نہ صرف حیرت کے ساتھ لیا؛ بلکہ ان کو سمجھ کر ان کو ترقی دینے کی کوشش میں لگ گئے، اس کے برعکس مغل حکمرانوں نے کبھی یہ سمجھنے کی کوشش نہ کی کہ اسپرنگ کلاک کیا چیز ہے، وہ صرف اتنا ہی جانتے تھے کہ یورپی تاجروں کے ذریعہ ان کو مہنگے داموں میں خرید لیں یا بطور تحفہ وصول

کر کے ان کو اپنے محل کی زینت بنائیں۔

غزوۂ خندق ۵ھ کے موقع پر مشرکین کی دس ہزار فوج نے ابوسفیان کی سرداری میں مدینہ پر چڑھائی کی تھی، جب وہ لوگ مدینہ کے قریب پہنچے اور وہاں شہر کے کنارے گہری خندق کھدی ہوئی دیکھی تو ابوسفیان نے کہا: خدا کی قسم یہ ایک ایسی تدبیر ہے کہ اس طرح تدبیر کرنا ابھی تک عرب نہ جانتے تھے، گویا اس زمانہ کے مسلمان تدبیر اور طریق عمل میں اتنا زیادہ آگے تھے کہ ان کے مخالفین ان کی تدبیروں کو دیکھ کر پکار اٹھتے تھے کہ ہم تو ابھی تک ایسی تدبیروں سے واقف بھی نہ تھے۔ (الرسالہ اکتوبر ۱۹۷۹ء صفحہ ۱۲)

معلوم ہوا کہ مسلمان جو کسی وقت ساری دنیا میں سب سے آگے تھے، آج دنیا بھر میں سب سے پیچھے ہو گئے، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں میں ایمانی قوت، اسلامی غیرت اور تعمیری ذہن نہیں رہا، آگے بڑھنے کا حوصلہ جو ترقی یافتہ اقوام کی کامیابی کا راز ہے، مسلمانوں نے اس سے منہ موڑ لیا اور تقلید اور غلامانہ نقل وحرکت کو باعث افتخار سمجھنے لگے، ظاہر ہے کہ یہ احساس انسان کو انحطاط اور ذلت ورسوائی کا ہی تحفہ دے سکتا ہے، اس سے عظمت کا نشان حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

ترقی اور عروج کے لیے حوصلہ مندانہ قدم کے ساتھ صبر واستقامت از حد ضروری ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی رسالت کا اعلان کیا تو مکہ کے تمام باشندے آتش حسد میں جل کر کباب بن گئے، عداوت ودشمنی کی ساری راہیں اختیار کر لی گئیں، اور تسلسل کے ساتھ کم وبیش دس سال تک آپؐ مصائب کے شکار رہے، مگر صبر، عزم وحوصلہ، عالی ظرفی، بلند نگاہی اور استقامت کے ذریعہ یہ مشکلات خود بخود آسانیوں میں تبدیل ہو گئیں اور ایک وہ وقت آیا جب اسلام دشمن طاقتیں اسلام کے سامنے سجدہ ریز تھیں، عرب وعجم میں توحید کا پرچم لہرایا جانے لگا، لوگ اس کی عظمت و شوکت سے حیرت زدہ رہ گئے، اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا میں اسلام کا نام روشن ہو گیا، اگر آپ کفار مکہ کی حرکتوں سے بددل ہو جاتے تو شاید یہ فتح کا نشان آپ کو حاصل نہ ہو سکتا، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے مختلف اسلوب میں مسلمانوں کو ہدایت دی ہے کہ اپنے ایمان وعقائد کے ساتھ دوام اور ثبات کی صفت اختیار کریں اور جذباتیت کو راہ دیئے بغیر اپنے کام میں منہمک رہیں کہ یہی انسان کی بلندی اور ترقی کا وسیلہ ہے اور اسی زینہ کے ذریعہ انسان بام عروج کو پہنچ سکتا ہے۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ دین و مذہب کے حکیم تھے ہی، دنیوی اعتبار سے بھی وہ بڑے دانا، نباض، وقت شناس اور روشن دماغ تھے، ان کی دنیوی حکمت نے بے شمار لوگوں کے ویران مستقبل کو تابناکی میں تبدیل کیا ہے، حوصلہ منداور کام کرنے والوں کے لیے ان کی یہ حکیمانہ بات انتہائی مفیداور کارآمد ہے، ایک مجلس میں انہوں نے فرمایا:

''کام کرنے سے راستہ کھلتا ہے، اس انتظار میں نہ رہے کہ پہلے سے راستہ نظر آئے تو آگے قدم رکھے، اس کی مثال ایسی ہے کہ بڑی سڑک پر جس کے دوطرفہ درخت لگے ہوں، اور سیدھی جارہی ہو، اگر کھڑے ہوکر دیکھو گے تو کچھ دور کے بعد دونوں طرف کے درخت باہم ملے ہوئے نظر آتے گے، لیکن جوں جوں آگے بڑھے گا راستہ کھلتا نظر آئے گا'' (مجالس حکیم الامت صفحہ: ۲۲۵)

یعنی ایک حقیقی طلبگار کو اپنا علمی وتحقیقی سفر ہمیشہ جاری رکھنا چاہیے، اگر ایک دن میں کوئی مقصود حاصل کیا جاسکتا تھا اور وہ ہاتھ نہ آیا تو بددل اور مایوسی کا شکار نہ ہونا چاہیے، تسلسل کے ساتھ اگر جستجو ہو تو بڑی سے بڑی رکاوٹیں دور ہوجاتی ہیں، اور منزل تک پہنچنا آسان ہوجاتا ہے۔ فانی بدایونی نے بھی امت کو یہی پیغام دیا ہے:

وہ مسافر ہوں جو ہو ختم سفر سے بے نیاز
میری ہر منزل نشان راہ ہے منزل نہیں

تاریخ کے صفحات میں ہزاروں ایسی عظیم شخصیتوں کا نام ملتا ہے جن کا رعب و دبدبہ دلوں پر آج بھی قائم ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے کس طرح ایسے بڑے کارنامے انجام دیئے جو ہمارے تصور سے بھی ماورا ہے، ان میں سے بعض محدث ہیں، بعض فقیہ، بعض مصنّفین اور بعض نے سائنسی اور ٹکنالوجی اعتبار سے انفرادیت اور عظمت کا لوہا منوالیا ہے؛ لیکن یاد رہے کہ یہ کارنامے اور قوم وملت کی عظیم ترین خدمات جنہیں ہم سیکنڈوں میں پڑھ کر گزر جاتے ہیں، آسانی سے ہاتھ نہیں آگئیں؛ بلکہ ہر شہرت اور کارنامے کے پیچھے طویل مشقت اور مختلف مصائب کی داستان پوشیدہ ہوتی ہے، شاعر نے یہ راز اس طرح بیان کیا ہے:

ہم نے طے کی اس طرح سے منزلیں
گر پڑے، گر کر اٹھے، اٹھ کر چلے

مشترکہ خاندانی نظام ــــ مشکلات اور حل

مفتی امدادالحق بختیار
استاذ جامعہ اسلامیہ دارالعلوم حیدرآباد، انڈیا

ہندوستان ایک قدیم ترین ملک ہے، یہاں کی کچھ اپنی تہذیب، اپنی روایات ہیں، اسلام نے جب سے یہاں اپنے برگ وبار پھیلائے، اسلام کی رعنائیوں اور اس کی ظاہری و باطنی خوبیوں سے متأثر ہوکر لوگ جوق در جوق حلقہ بگوشِ اسلام ہونے لگے اور ہندوستان کے ایک بڑے حصے پر مذہب اسلام کا پرچم لہرانے لگا، مسجدوں، خانقاہوں اور مدرسوں میں اسلام کا پاکیزہ اور شیریں زمزمہ بلند ہونے لگا۔

لیکن ہندوستانی تہذیب وروایات اور طریقۂ رہن سہن جو ہندوستانیوں کی طبیعت اور فطرت میں قدیم زمانے سے سرایت کیے ہوئے تھا اور ان کی زندگی کا اٹوٹ حصہ بن چکا تھا، اسلام کا طویل سفر بھی ہندوستانی مسلم معاشرہ کو اس سے نجات نہ دلا سکا، ایسی بہت ساری رسم ورواج اور تہذیب وروایات ہیں جو اسلامیان ہند کو بری طرح جکڑے ہوئے ہیں، انہی میں سے ایک ''مشترکہ خاندانی نظام''(Joint Family System) کی قدیم روایت ہے۔

یہ روایت پورے برصغیر میں عام ہے، شادی کے بعد ایک باپ کی تمام اولاد کا زندگی کے کئی اہم شعبوں جیسے رہن سہن، کھانا پینا اور کاروبار وغیرہ میں ایک ساتھ رہنا عزت واحترام کی علامت سمجھا جاتا ہے، اس شرکت میں نہ ذمہ داریاں تقسیم ہوتی ہیں، نہ حیثیت کا تعین اور نہ کوئی دیگر تفصیل ہوتی ہے، جس کی وجہ سے بعد میں سخت اختلافات کھڑے ہوجاتے ہیں اور جس

گھرانے اور جس خاندان میں یہ رسم چلتی ہے، اسے معاشرے میں معزز گھرانہ اور خاندان سمجھا جاتا ہے، شادی کے فوراً بعد اگر کسی کے گھر میں بیٹے کا چولہا الگ ہو جائے، تو والدین اس میں اپنی بے عزتی محسوس کرتے ہیں اور معاشرے میں بھی اسے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا، لیکن یہ مشرقی روایت ہے، اسے اسلامی تہذیب نہیں کہا جاسکتا۔

مثبت اور منفی پہلو:

اجتماعیت میں بظاہر بہت سے فوائد نظر آتے ہیں: جیسے ایک ساتھ رہنے کو معاشرہ محبت کی علامت سمجھتا ہے، جس کے کچھ معاشرتی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں، نیز الگ الگ رہنے کی بہ نسبت بہت کم خرچ میں اتنا بڑا گھر چلتا ہے اور اگر وقتی طور پر گھر کا کوئی ایک فرد کاروبار سے مربوط نہ بھی ہو، تب بھی اس کا اور اس کی بیوی اور بچوں کا گذارا آسانی سے ہوتا رہتا ہے، مزید یہ کہ مال وجان کے تحفظ کے ساتھ ساتھ عزت وآبروی بھی محفوظ رہتی ہے، وہ کہیں بھی دو چار روز؛ بلکہ مہینوں کا سفر بغیر کسی تشویش کے کرسکتا ہے، جب کہ الگ الگ رہنے کی صورت میں موجودہ دور میں پڑوسیوں سے ہر وقت خطرہ بنا رہتا ہے، اسی طرح مشترکہ خاندانی نظام کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اگر والدین معاش سے جڑے ہوئے نہ ہوں اور چھوٹے بھائی، بہن ہوں، تو اس نظام کے تحت ان کی کفالت بآسانی ہوجاتی ہے؛ لیکن اجتماعیت میں ان فوائد کے ساتھ ساتھ ایسے بھیانک دینی اور دنیوی نقصانات ہیں، جن کے سامنے ان فوائد کی کوئی حیثیت اور ان کا کوئی وزن باقی نہیں رہ جاتا۔

والدین کے حقوق کا ضیاع:

ہندوستانی معاشرہ میں اکثر والدین مشترکہ خاندانی نظام کے نہ صرف قائل؛ بلکہ سختی کے ساتھ اس قدیم روایت پر کاربند رہتے ہیں، تاہم بعض ایسے بھی والدین ہیں، جو بعض مجبوریوں اور ناگزیر وجوہات کی وجہ سے کسی خاص اولاد یا سب کے تعلق سے اس نظام کو پسند نہیں کرتے؛ لیکن معاشرہ کے ڈر اور دباؤ کی وجہ سے کوئی ٹھوس اور مؤثر عملی اقدام کرنے سے عاجز رہتے ہیں، اُدھر بعض اولاد بھی اپنی نااہلی، احساس ذمہ داری نہ ہونے اور اپنے بیوی بچوں کا بوجھ نہ اٹھانے کی وجہ سے زبردستی مشترکہ نظام میں رہنا چاہتے ہیں، جس کی وجہ سے والدین سخت ذہنی دباؤ اور قلبی تکلیف میں ہر وقت مبتلا رہتے ہیں، نیز ایک ساتھ رہنے کی صورت میں خود اولاد سے

اور بہت سے موقعوں پر ان کی بیویوں سے والدین کے حق میں بڑی بڑی کوتاہیاں سرزد ہوجاتی ہیں، ایسی اولاد کو یاد رکھنا چاہیے کہ وہ والدین کو تکلیف پہنچا کر، نہ صرف اپنا دین برباد کررہے ہیں، بلکہ دنیا بھی ویران کررہے ہیں، انہیں بروقت اپنی اس غلطی پر متنبہ ہونا چاہیے اور والدین سے معافی مانگنی چاہیے۔

بیوی کے حقوق کی پامالی:

مخلوط خاندانی نظام میں عورت کی شخصی آزادی، نجی زندگی سے متعلق امور، آرزوئیں اور تمنائیں سب دفن ہوکر رہ جاتی ہیں، شریعت میں ایک بیوی ہونے کی حیثیت سے جو حقوق اسے دیے گئے ہیں، اس کا دس فیصد بھی اسے نہیں ملتا، بلکہ بہت سے علاقے اور گھرانے ایسے ہیں جہاں اسے ایک خادمہ سے زیادہ حیثیت نہیں دی جاتی، گھر کے بڑے سے لے کر چھوٹے افراد تک اس پر اپنا حکم صادر کرنے سے نہیں چوکتے اور اس سے خدمت لینے کو اپنا واجبی حق سمجھتے ہیں، ہمارے معاشرے میں بہو گھر کی ایک بے حیثیت فرد ہوتی ہے، جس کی اپنی کوئی مرضی، کوئی پسند اور کوئی رائے نہیں ہوتی، دوسروں کی پسند، دوسروں کی خوشی اور ان کی رائے اس پر زبردستی تھوپی جاتی ہے۔

اس پر مستزاد یہ کہ بہت سے ظالم اور جاہل شوہر بیوی کے حقوق سے نابلد ہوتے، وہ بیوی کا اپنے اوپر سوائے دو وقت کے کھانے کے کوئی حق نہیں سمجھتے، ہر وقت اپنے غیض وغضب اور زہر میں ڈوبے ہوئے الفاظ سے اس کی دل شکنی کرتے ہیں اور اگر وہ ''اف'' بھی کرے، تو اس مظلومہ کو تختۂ مشق بنادیا جاتا ہے، یہ انتہائی جاہل اور بدترین قسم کے لوگ ہوتے ہیں، وہ بیوی کو اپنے ماں باپ، بھائی، بھابھی اور بہنوں کے حوالے چھوڑ دیتے ہیں، وہ جیسا چاہیں اس کے ساتھ سلوک کرتے رہیں، نہ اس کی خواہشات اور تمناؤں کا لحاظ کیا جاتا ہے، نہ مناسب نان ونفقہ اور ماہانہ خرچ کی طرف توجہ کی جاتی ہے، ایسے لوگ اسلام کو زندہ کرنے والے نہیں، بلکہ بدنام کرنے والے ہیں، اس کے پاسباں نہیں بلکہ راہزن ہیں، ان کے حق میں اللہ اور اس کے رسولؐ نے سخت وعیدیں بیان کی ہیں۔

بھائیوں کے حقوق کا ضیاع:

اجتماعیت کا ایک منفی پہلو یہ بھی ہے کہ اس کی آڑ میں بعض افراد خانہ، کاہل، سست اور

کام چور ہوجاتے ہیں، ایک دو فرد کماتے ہیں اور وہ اپنی پوری پونجی گھر کے خرچ میں دیتے رہتے ہیں، جس کی وجہ سے بعض اوقات خود ان کو اور ان کے بیوی بچوں کو پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے؛ اگر چہ وہ اپنی ذاتی شرافت کی وجہ سے کچھ کہتے نہیں؛ لیکن دل میں ناگواری ضرور محسوس کرتے ہیں، اور حدیث شریف میں ہے: **لا یحل مال امرئٍ مسلم إلا بطیب نفسه.**

اکثر ایسے گھروں میں بڑی اولاد کے بچوں کی مکمل پرورش، پوتے، پوتیوں کی محبت کے جذبے سے دادا، دادی ہی کرتے ہیں، جس سے ان کی کاہلی اور سستی میں مزید اضافہ ہوتا ہے، نیز چھوٹا بھائی سخت محنت ومشقت سے کمانے کے باوجود بڑوں کے احسان تلے دبا رہتا ہے اور اس کا دل اسے محسوس بھی کرتا ہے، مگر معاشرہ کی وجہ سے وہ زبان نہیں کھول پاتا، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ والد کے ساتھ جو بھائی کاروبار میں شریک ہوتا ہے، والد کی وفات کے بعد وہی کاروبار کا مالک سمجھا جاتا ہے، دوسرے بھائیوں کو کچھ دیا بھی جاتا ہے تو بہت کم، نیز بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے، جو بھائی کاروبار میں اہم حیثیت رکھتا ہے، وہ اختلافات کے وقت دیگر بھائیوں کو خالی ہاتھ روڈ پر کھڑا کر دیتا ہے۔

چیزیں مشترک رہنا:

اسی طرح بعض اوقات چیزیں مشترک رہنے اور معاملات واضح نہ ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کی حق تلفی ہوتی ہے، جیسے ہندوستانی معاشرہ میں اس کو بھی اتحاد واتفاق اور محبت کی علامت سمجھا جاتا ہے کہ والد کے انتقال کے بعد وراثت تقسیم نہ کی جائے، سالہا سال تک زمین وجائداد مشترک رہتی ہے، بسا اوقات ان سے حاصل ہونے والی پیداوار اور آمدنی کا حساب وکتاب نہیں ہوتا، بہنوں کو ان کا حصہ نہیں دیا جاتا، بھائیوں کی بھی حق تلفی ہوتی رہتی ہے، جس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اخیر میں ایک بڑے اختلاف اور باہمی نزاع کے بعد اتحاد واتفاق کا یہ بھرم چکنا چور ہوجاتا ہے۔

باہمی نزاع:

پر امن زندگی کا یہ اصول: "**تعاشروا کالإخوان و تعاملوا کالأجانب**" (یعنی آپس میں بھائیوں کی طرح رہو اور معاملات اجنبیوں کی طرح کرو) لیکن آج کل ان دونوں جملوں کے اول جزو میں قلب واقع ہوگیا ہے اور "**تعاملوا کالإخوان وتعاشروا کالأجانب**" (معاملات بھائیوں کی طرح کرو اور آپس میں اجنبیوں کی طرح رہو) کی صورت

حال پیدا ہوگئی ہے، چناں چہ اجتماعیت میں ایک دوسرے کی حق تلفی اور معاملات کی صفائی نہ ہونے کی وجہ سے دلوں میں جو کدورت اور بدگمانی پکتی رہتی ہے،بعض اوقات وہ زبان سے بھی ظاہر ہوجاتی ہے اور باہمی اختلافات اور آپسی جھگڑے کا باعث بنتی ہے،جس سے دین بالکل ضائع ہوکررہ جاتا ہے،حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: **وفساد ذات البين هي الحالقة** یعنی آپس کے جھگڑے، آپس کی نفرتیں اور ناچاقیاں یہ مونڈنے والی چیزیں ہیں،ایک دوسری حدیث میں اس کی مزید وضاحت ہے: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں یہ نہیں کہتا کہ آپس کے یہ جھگڑے تمہارے بالوں کو مونڈنے والے ہیں؛ بلکہ یہ جھگڑے تمہارے دین کو مونڈنے والے ہیں۔لہذا اس ناگوار صورت حال سے بچنے کی ہمیں ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔

ظلمِ بے جا:

مشترکہ خاندانی نظام کی بہت سی خرابیوں میں سے بعض گھروں میں ایک خرابی یہ بھی ہے کہ گھر کی بڑی یا لاڈلی بہو گھریلو کام کاج میں انتہائی سست ہوتی ہے، جب کہ دوسری بہو پورے گھر کا کام اکیلی کرتی ہے،سب کا کھانا پکاتی ہے،سب کے کپڑے دھوتی ہے،تمام برتن مانجتی ہے اور پورے گھر کی صفائی کرتی ہے،مجال نہیں کہ وہ اپنے کسی ذاتی کام میں لگ جائے،غرض دن بھر اسی میں لگی رہتی ہے،اس کے باوجود اسے طعنے سننے پڑتے ہیں،اور لاڈلی بہو کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا، کیوں کہ بسا اوقات ساس،سسر کی تائید اسے حاصل رہتی ہے،اس کی وجہ سے اس مظلومہ بہو کے دل میں شدید نفرت اور بغض وعداوت کی بھٹی سلگتی رہتی ہے،جس سے اس کی زندگی اجیرن بن کے رہ جاتی ہے۔اس ظلم کے ذمہ دار وہ والدین بھی ہیں جو اس طرح کے نظام کو لازمی طور پر نافذ رکھنے پر مصر رہتے ہیں،لہٰذا انہیں اپنی آنکھیں کھولنی چاہیے اور آخرت کی فکر کرنی چاہیے۔

بے پردگی:

اس نظام کا ایک انتہائی خطرناک پہلو یہ ہے کہ اس میں کئی خاندان اور ان کے بچے ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہیں،جس سے لازمی طور پر بے پردگی ہوتی ہے،محرم وغیر محرم کا اختلاط ہوتا ہے اور اس سے بے شمار برائیاں وجود پذیر ہوتی ہیں اور تعجب یہ ہے کہ عوام کا تو ذکر نہیں کہ وہ بے چارے نہ شرعی احکام جانتے ہیں اور نہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں؛ لیکن بہت

سے خواص بھی ایسے ہیں جو اسے محسوس نہیں کرتے، یا جانتے ہوئے اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ایسے نظام میں بھابھیوں اور دیوروں کے درمیان بے پردگی عام رہتی ہے، جس کے بہت سے غلط نتائج بھی سامنے آتے ہیں، ورنہ کم از کم وہ ہر وقت بے پردگی کے گناہ میں تو مبتلا رہتے ہی ہیں، جس کی نحوست اور وبال سے انسان دنیا اور آخرت دونوں میں دوچار ہوگا۔

گھر کے ذمہ داروں میں سے اگر کسی ایک نے بھی اپنے اہل وعیال کی طرف سے بے توجہی برتی، جس کی وجہ سے ان کے بچوں کچھ بے راہ روی آئی، تو اس کے برے اثرات سے گھر کے تمام ہی افراد اور سارے بچے متأثر ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے اس نظام میں بچوں کی صحیح پرورش ایک چیلنج بن جاتی ہے۔

نیز جب یہ بچے اور بچیاں بڑے ہو کر بلوغ کی عمر کو پہنچتے ہیں، تو بعض اوقات عفت وعصمت کے تحفظ کا بھی سوال کھڑا ہوجاتا ہے؛ بالخصوص موجودہ ہوس ناکی، بے حیائی اور فحاشی وعیاشی کے دور میں یہ خطرہ مزید سنگینی اختیار کرلیتا ہے، ایک گھر میں رہنے والے بچے اور بچیوں میں چوں کہ ہر وقت ساتھ اٹھنا، بیٹھنا رہتا ہے، کوئی ان کے اخلاق اور آپسی میل ملاپ پر شک بھی نہیں کرتا، شیطان ایسے لڑکوں اور لڑکیوں کو غلط کاری کے زیادہ مواقع فراہم کراتا ہے۔اور اس کے بے شمار واقعات روزمرہ سننے اور پڑھنے میں آتے ہیں۔

ردِعمل:

مشترکہ خاندانی نظام کے ان منفی پہلوؤں سے تنگ آکر بہت سے نوجوان انتہائی سخت فیصلہ لے لیتے ہیں، باغیانہ طرز اختیار کر بیٹھتے ہیں، خاندان اور والدین سے ایسے دور ہوجاتے ہیں کہ پھر بہت کم پلٹ کر انہیں دیکھتے ہیں، آپس میں ایک گہری خلیج پیدا ہوجاتی ہے، جس کی وجہ سے پورا خاندانی نظام توڑ پھوڑ اور انتشار کا شکار ہوجاتا ہے، دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف سخت نفرت بیٹھ جاتی ہے اور وہ بالکل مغربی خاندانی نظام کے طرز پر چلنے لگتے ہیں، جس میں نہ والدین کا کوئی حق ہے، نہ اولاد کا، نہ رشتوں کا کوئی تقدس ہے اور نہ خاندان کا کوئی احترام۔یعنی ایک غلطی سے دوسری بھیانک غلطی وجود میں آتی ہے، لہذا ہمیں موجودہ خاندانی نظام پر غور کرنا چاہیے، ہمارے اور معاشرے کے خودساختہ معیار پر زبردستی قائم رہ کر، اپنے گھر کو برباد اور اپنے دین کو خراب نہیں کرنا چاہیے۔

کہاں گئے وہ دل والے لوگ

مولانا اسجد عقابی
استاذ دار العلوم وقف دیو بند

اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اہل اسلام نے مذہب کی حفاظت وصیانت اور ترویج واشاعت کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑا ہے، اسلام کی نشر واشاعت میں ایک تو خود مذہب اسلام کا اپنا اصول وضابطہ ہے، ایک ایسا اصول جو ہر فرد کے لیے یکساں ہے اور جس پر عمل کرنا ہر انسان کے لیے ممکن ہے، محلات میں رہنے والے سربراہان مملکت ہوں یا جھونپڑیوں میں بسنے والے فقراء، تمام کو اسلام میں یکسانیت حاصل ہے، اسلام میں وحدانیت کا تصور اتنا واضح اور صاف ہے کہ کوئی بھی سلیم الطبع انسان اس سے آنکھ نہیں چرا سکتا ہے، اسی طرح عبادات کے باب میں بیان کئے گئے تمام طریقے فطرت انسانی کے مطابق اور ہم آہنگ ہیں۔ غرضیکہ یہ اسلام کی اپنی خوبی اور صفات حمیدہ ہے جو ہر ذی ہوش اور سلیم الفکر انسان کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔ اس کے علاوہ اسلام کے ماننے والوں نے اسلامی حکم ''بلغوا اعنی و لو آیة'' (میرا پیغام پہنچاؤ چاہے ایک آیت ہی کیوں نہ ہو) پر عمل کرتے ہوئے اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین بنایا۔

اشاعت اسلام میں مسلمانوں کے دو طبقوں کا کردار کافی نمایاں اور اہم ہے۔ اول علماء کرام، دوم صوفیاء عظام سے ان دونوں طبقات نے اشاعت اسلام میں اہم کردار ادا کیا ہے؛ البتہ اگر ان کے کاموں کو تقسیم کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ علماء اسلام نے دفاع اسلام اور علمی میدان میں اہم کارنامے انجام دیے ہیں جب کہ صوفیاء کرام (صوفیاء کرام سے مراد وہ اولیاء اللہ جنہیں ظاہری و باطنی دونوں علوم میں دسترس ہو) نے خانقاہوں کے ذریعہ اشاعت اسلام کا کام کیا ہے۔ اگر ہم اپنے

ملک ہندوستان اور برصغیر کا تاریخی جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ صوفیاء کرام کے دست مبارک پر بیک وقت پورا کا پورا گاؤں مسلمان ہوا ہے۔خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے حالات زندگی، بابا فریدالدین گنج شکر، شیخ شرف الدین یحیی منیری اور دیگر حضرات کی حیات وخدمات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کثیر جماعت نے ان کے دست مبارک کو تھام کر راہ مستقیم کا راستہ منتخب کیا تھا۔اگر ہم موجودہ دور کا جائزہ لیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ملک ہندوستان اور دیگر ممالک میں اسلام کی ترویج واشاعت اور دینی تعلیم کا ایک دراز سلسلہ ہے۔کہیں مدارس کی شکل میں اسلامی قلعے موجود ہیں، کہیں اسلامک سینٹر کے نام پر لوگوں کو دینی تعلیم سے آراستہ کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔حالات اور وقت کا تقاضا بھی ہے کہ اسلامی تعلیمات کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے تاکہ لامذہبیت اور مادیت کی چکا چوند میں اپنا سب کچھ تلاش کرنے والے اپنے مالک حقیقی اور خالق سے رشتہ استوار رکھ سکے۔کیوں کہ خالق ومخلوق کے درمیان اگر رشتہ ٹوٹ جائے تو مخلوق کے حصہ میں خسارہ کے سوا کچھ اور نہیں آتا ہے۔لیکن ساتھ ساتھ ہمیں اس بات کا اعتراف بھی کرنا چاہیے کہ دل والے لوگ جو اپنی نگاہ ناز سے لوگوں کی کایا پلٹ دیا کرتے تھے، جن کی نگاہوں میں وہ تاثیر تھی کہ بادشاہوں کی سواریاں ان کے سامنے سے گزرنے کی روادار نہیں ہوا کرتی تھی۔جن کے دربار میں عوام اور بادشاہ دونوں برابر تھے اور جن کے فیض سے استفادہ کی خاطر جھونپڑی میں رہنے والے اور محلات میں پلنے والے دونوں آیا کرتے تھے۔لیکن آج اگر ہم اپنے اطراف کا جائزہ لیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اس ترقی یافتہ زمانہ میں جب کہ ہر میدان میں ترقی ہورہی ہے۔علمی میدان میں کام کرنے والوں کے لیے آسانیاں فراہم ہیں۔تعلیمی اداروں کے نام پر عالیشان پرشکوہ عمارتیں اور دیدہ زیب نقش ونگار آنکھوں کو خیرہ کئے ہوئے ہیں۔ کتابوں کی فراوانی ہے، وسائل کی بہتات ہے اور مختلف علمی میدانوں میں کام کرنے والے مختلف ناموں سے جانے جاتے ہیں اور ان کے کارنامے آئے دن اخبارات اور سوشل میڈیا کی زینت بنتے نظر آتے ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ دور کے انسانوں نے علمی میدان میں وہ مقام ومرتبہ حاصل کیا ہے جو شاید پہلے نہیں تھا، لیکن اب جس چیز کی کمی محسوس کی جارہی ہے وہ روحانیت ہے۔علم دین کے ذرائع یقینا بے شمار ہیں اور کتابوں کی فراوانی نے ہر چیز کو پہلے سے کہیں زیادہ آسان اور سہل بنا دیا ہے؛ لیکن چوں کہ یہ بات اظہر من الشمس ہے

کہ علم دین محض ظاہری باتوں کو جاننے کا نام نہیں ہے بلکہ اس میں تاثیر اور چاشنی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب علم کے بحر بے کراں میں روحانیت کی آمیزش ہو، علمی میدان میں تفوق اور رسوخ پیدا کرنے کے بعد کسی عارف باللہ اور اہل دل کی مجلس کا انتخاب کر کے وہاں کچھ دنوں کے لیے قیام کیا جائے تا کہ دل کی دنیا مزید منور ہو اور اس میں اپنے ساتھ دوسروں کو بھی جگمگانے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اگر ہم اپنے اسلاف واکابرین کی تاریخ دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں جس طرح دینی علوم میں دسترس کو ضروری سمجھا جاتا تھا، اسی طرح کسی شیخ کے دامن ارادت سے وابستہ ہو کر تزکیہ قلوب کے لیے جفا کشی کو بھی لازم تصور کیا جاتا تھا۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی دنوں میں اساتذۂ کرام اور طلبہ کی بات تو کجا، مدرسہ کے جاروب کش بھی صاحب نسبت ہوا کرتے تھے۔لیکن افسوس کہ زمانہ نے ایسی کروٹ کھائی کہ خانقاہوں کو آباد کرنے والے اور شب کی تاریکی میں اپنے بستروں سے جدا ہو کر رب صمدیت کی بارگاہ میں آنسو بہانے والے کم ہوتے گیے اور آہستہ آہستہ اس جانب سے لوگوں کا مزاج بھی ہٹتا چلا گیا۔ مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی اپنے والد محترم کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ ہم نے دو دکانیں ایسی دیکھی ہیں جہاں دل کا سودا ہوتا ہے، ایک دکان گنگوہ میں جسے مولانا رشید احمد گنگوہی چلا رہے ہیں اور دوسری دکان گنج مرادآباد میں جسے مولانا فضل رحماں گنج مرادآبادی آباد کئے ہوئے ہیں۔ یہ دل والے لوگ تھے جہاں دلوں کا سودا ہوتا تھا، اور قلوب میں ایسی تحریک پیدا کی جاتی تھی کہ انسان معرفت الٰہی کے حقیقی مفہوم سے آگاہ ہو جایا کرتا تھا۔ ایک بات دور حاضر کے عوام اور خصوصا علمائے کرام کو سمجھنا چاہیے کہ تزکیہ قلوب دین و دنیا کی بھلائی اور دوسروں تک اپنی بات پہنچانے کا بہت اہم ذریعہ ہے۔ مادیت کے سیل رواں نے ہم سب کو دنیاوی زندگی میں اس قدر مشغول کر دیا ہے کہ بسا اوقات حلال وحرام کی تمیز ختم ہو جاتی ہے اور شکوک وشبہات کے سائے میں ہونے کے باوجود کنارہ کشی اختیار کرنے کے بجائے دلدل میں پھنسے رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگر انسانی قلوب معرفت الٰہی سے معطر ہو اور خوف خدا انسانی قلوب میں جاگزیں ہو تو پھر مادیت کی بہتات بھی انسان کو صراط مستقیم سے منحرف کرنے سے عاجز ہوتی ہے۔ اہل اللہ کی مجالس ومحافل میں بیٹھنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ دل اللہ کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور انسانی دماغ دنیاوی آسائش وزیبائش سے ہٹ کر آخرت اور آنے والی زندگی کے متعلق سوچنے کی فکر کرتا

ہے۔اگر ذکرواذکاراوراورادووظائف کی مجالس میں شرکت پر مداومت اختیار کی جائےتوتزکیہ قلوب میں بہت مدد ملتی ہےاورارشادربانی ’’آگاہ ہوجاؤ کہ اللہ کی یاد ہی سے دلوں کوسکون ملتا ہے‘‘(سورہ رعد آیت 28)۔اس آیت کی تفسیر میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں:’’عام طور پر مادی سہولتوں کوسکون واطمینان کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے:لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے،اطمینان دل کی اس کیفیت کا نام ہے کہ جس میں انسان کوقرارآجائے اورآگے کی لالچ باقی نہ رہے،مادی نعمتوں کی حرص جن لوگوں کے دلوں میں جگہ بنالیتی ہے،ان کی منزل کبھی نہیں آتی ہے،وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں بے چین رہتے ہیں،لیکن جن لوگوں کا اللہ پر یقین ہوتا ہے،اللہ کی یاد سے ان کے دلوں کو طمانینت حاصل ہوجاتی ہے،اگراس نے کم دولت بھی حاصل کی تو یہ سوچ کر کہ چوں کہ اللہ کا یہی فیصلہ ہےاورہم اس پرراضی ہیں،اس کا دل مطمئن ہوجاتا ہے۔لیکن دل کی یہ کیفیت ایک دن میں نہیں ہوتی ہے بلکہ دل کواس کام کے لیے تیار کرنا پڑتا ہے،عبادت وریاضت اور یادالٰہی سے دل کی دنیا کو بسانا پڑتا ہےاورمحبت الٰہی کے جام سے دل کوسرشار کرنا ہوتا ہےتب جاکردل دنیاوی لذتوں میں الجھنے کے بجائےحقیقی لذتوں کا خواہش مند بنتا ہے۔اس سلسلہ میں اعتراض ہوتا ہے کہ کیا ہم دنیاوی نعمتوں اورلذتوں سےکلی طور پر دست بردار ہوجائیں اوردنیا میں ہونے والےتغیرات سے آنکھیں موندکرکسی غار میں جابیٹھیں؛ کیوں کہ صوفیاءکرام کی زندگی اوران کی باتوں سے بظاہر یہی لگتا ہے کہ دنیاوی آسائش وزیبائش سے کنارہ کشی کئے بغیر ولایت حاصل نہیں ہوتی ہے۔ہم بخوبی جانتے ہیں کہ اسلام میں رہبانیت کے لیےکوئی جگہ نہیں ہے،اورہمارےاکابرین جنھوں نےسلوک ومعرفت کی راہ کواپنایا ہےان میں ایسے بھی تھے جنھوں نے بوقت ضرورت میدان کارزار میں علم اسلام کو بلند کیا ہےاورشمشیر وسنان کی چھاؤں میں آرام کیا ہے،ایسے بھی تھے جواپنے زمانے کے کامیاب ترین تاجراور مال ودولت والے تھے۔راہ سلوک پر چلنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیاوی اسباب سے کنارہ کشی اختیار کی جائے؛ بلکہ اطاعت رسول ﷺ کواپنی زندگی کا مقصد بنایا جائے اوراپنے ہرکام اور ہرعمل میں اسلامی تعلیمات کومقدم رکھےاور یہی اصل تصوف وسلوک ہے اور ہمارےاکابرین اسی پرچل کرکامیاب ہوئے ہیں۔تصوف کی حقیقت یہ ہے کہ انسان خدائی احکام اورتعلیمات نبوی ﷺ پرگامزن رہے۔

موت سے پہلے اپنی نسلوں کو ایمان سے جوڑیئے

مفتی محمد فردوس حلیمی
سکریٹری تعلیمی وملی بورڈ بھاگلپور

ایک مسلمان کو دنیا میں رہنے کے لیے، آخرت میں اللہ اور اس کے رسول کے سامنے منہ دکھانے کے لیے، نجات پانے کے لیے، دینی تعلیم اور اسلام کی بنیادی باتوں سے واقفیت کی ضرورت ایسے ہی ہے جیسے ایک انسان کو دنیا میں زندہ رہنے کے لیے ہوا اور پانی کی ضرورت ہے۔

حضرت یعقوبؑ نے موت کے وقت خاندان کے افراد کو جمع کر کے فرمایا "کہ تم لوگ میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ ان لوگوں نے کہا کہ میں آپ کے معبود اور آپ کے آباء واجداد کے معبود کی عبادت کروں گا جو کہ ایک معبود ہے" ذرا ہم سوچیں کہ حالت احتضار میں انسان کو وصیت کرنے کی ہزار باتیں ہوسکتی ہیں جیسے خاندان کے تمام افراد محبت سے رہیں، مشکل وقت میں ایک دوسرے کی مدد کریں، حلال رزق اور اچھی کمائی کریں وغیرہ، لیکن وقت کے نبی ان باتوں پر اطمینان چاہ رہے تھے کہ میری اولاد کے پاس جو ایمان ہے کیا اس پر وہ قائم رہے گی؟ جس پر اللہ کی ہر رحمت، خدا کے ہر بہتر فیصلے، فرد وملت کی نجات اور پوری انسانیت کے مستقبل کا دارومدار ہے۔ یہ چیزیں اصل میں مسلمانوں کے ذہنوں کو ڈھالنے والا سانچہ ہے اور ایمان کی قیمت کو سمجھنے کا معیار ہے۔

ذرا ہم دیکھیں کہ کیا ملت اسی ذہن سے کام کر رہی ہے؟ کیا ہمارا معاشرہ اپنی اولاد کے بارے میں ایسی ہی فکر رکھتی ہے جیسا کہ حضرت یعقوبؑ اپنی نسل کے بارے میں سوچ رہے تھے

، ہندوستان کی آئندہ نسل ہمارے بعد کس راستہ پر چلے گی؟ وہ کس گروہ اور قوم کی پیروی کرے گی ؟ وہ کتنے معبود کے پرستار ہوگی؟ اس چار دن کی زندگی میں خدائے واحد کو مانے گی یا ہزاروں اور لاکھوں معبود کی پرستش کے پنجرا میں خود کو قید کرلے گی؟ ہمیں اور آپ کو اس ذمہ داری کے لیے، اس فکر کے لئے اور اس وراثت کے لئے اپنے دل و دماغ کو ٹٹولنا ہوگا۔

اب مسئلہ فرد کا یا صرف ایک خاندان کا نہیں رہا؛ بلکہ پوری ملت اسلامیہ ہندیہ کا ہوگیا ہے اس تعلیمی انقلاب اور معنوی نسل کشی سے یہ اولاد نہ صرف اپنی ماضی سے کٹ رہی ہے بلکہ اپنے دین، اپنی پہچان، اسلامی غیرت وحمیت، اسلامی حقائق وعقائد سے نہ صرف دور ہورہی ہے؛ بلکہ بیزار کی طرف گامزن ہے۔

ہم آپ جانتے ہیں کہ اکثریتی سماج کے سامنے ہماری پوزیشن اقلیت کی ہے، صرف ہندوستان ہی نہیں؛ بلکہ بین الاقوامی سطح پر یہ بھی معلوم ہے کہ اس وقت ہندوستان میں مسلمان کتنے برے حالات سے دوچار ہے، تو اب ہمیں خود فیصلہ کرنا ہوگا کہ اپنی دینی تعلیم کا تحفظ، اس کے انتظامات، آئندہ نسلوں کو اسلام پر باقی رکھنے کا ساز وسامان اور ان پر کی جانے والی محنتیں کتنی ضروری ہیں؟ اور اس بات کو بھی سمجھنا ہوگا کہ اس ملک میں صرف جان کی تحفظ کی بھیک مانگ کر جانوروں کی طرح زندگی نہیں گذاریں گے، بلکہ عزت وآبرو کے ساتھ، اپنی پوری دینی خصوصیات کے ساتھ، اسلامی شعائر کے ساتھ، قرآنی کلچر وثقافت کے ساتھ اس ملک میں رہیں گے اور یہیں دفن ہوجائیں گے۔

دلوں کا سکون اللہ کے ذکر میں ہے

محمد عرفان فلاحی
پی ایچ ڈی، شعبہ اسلامک اسٹڈیز

عصر حاضر تہذیب وتمدن اور تحقیق وترقی کا دور ہے۔نئ نئ ایجادات و اکتشافات اور انسانی کوششوں کے نتیجے میں ہونے والی تخلیقات نے آج کے انسان کے حوصلے بلند کردیئے ہیں اس لیے وہ زمین وآسمان کی وسعتوں اور سمندر کی گہرائیوں کو ناپنے کے بعد آفتاب و ماہتاب پر کمندیں ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ٹکنالوجی کے اس دور میں دھات کے پرزوں سے بنی بے جان مشینوں سے انسانی دماغ کا کام لیا جارہا ہے۔کئی کئی گھنٹوں کے کاموں کو منٹوں اور سکنڈوں میں کرلینا ایک عام بات ہوگئی ہے،مہینوں کی مسافت کو گھنٹوں میں طے کرلینا ایک معمولی بات سمجھی جاتی ہے۔ایسے کامیاب ذرائع ابلاغ مہیا کر لیے گئے ہیں کہ چند لمحوں میں اپنی بات پوری دنیا میں پھیلائی جاسکتی ہے۔آرام وآسائش اور تزئین وآرائش کے ایسے سامان تیار کر لیے گئے ہیں کہ چند سال پہلے انسان ان کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ملبوسات و ماکولات کی اتنی قسمیں بنالی گئی ہیں کہ انھیں شمار کرنا بھی مشکل ہے۔آرام وراحت اور اطمینان وسکون حاصل کرنے کے لیے ہزار ہا نئے طریقے رائج ہوگئے ہیں۔

لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ! کیا انسان نے دنیا کی اس مادی ترقی اور ظاہری چمک دمک سے سکون اور اطمینان حاصل کرلیا ہے؟ قلبی راحت اور روحانی آسودگی مل گئی ہے؟ کیا واقعتا ان

ایجادات و اکتشافات اور تہذیب وتمدن کی بدولت آج کا انسان پہلے کے انسان سے زیادہ شائستہ اور مہذب ہوگیا ہے؟ اگر ہم آج کی اس متمدن اور ترقی یافتہ دُنیا کا عمومی جائزہ لیں تو ان سارے سوالات کا جواب نفی میں ملے گا، یہاں تک کہ مشاہدہ اور تجربہ یہ بتا تا ہے کہ آرام و راحت کے یہ وسائل و ذرائع جس قدر بڑھتے جارہے ہیں قلبی اضطراب اور روحانی بے چینی میں بھی اسی قدر اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ مادیت کے اس دور میں ظاہری چمک دمک اور رنگا رنگی میں گرفتار انسانیت تڑپ رہی ہے اور چیخ وپکار کررہی ہے اور سکون کی تلاش میں در در کی ٹھوکریں کھارہی ہے۔لیکن کسی بھی طرح اطمینان وراحت اور قلبی و روحانی سکون میسر نہیں ہو رہا ہے۔ عدل وامانت کی جگہ ظلم اور بددیانتی بڑھتی جارہی ہے،صبر وقناعت کی جگہ بےصبری اور حرص وطمع نے لے لی ہے،عفت وحیا کی جگہ بےشرمی و بےحیائی عام ہوگئی ہے،صدق وصفا کے بدلے جھوٹ اور فریب انسان کا شیوہ ہوگیا ہے، اخلاص ومحبت کے بجائے منافقت، چالاکی ،مکاری وعیاری عام ہے۔اعلیٰ قدریں جن سے انسانیت عبارت تھی ایک ایک کر کے رخصت ہوتی جارہی ہیں۔اورانسان اندر سے بالکل کھوکھلا ہوکر رہ گیا ہے۔

موجودہ دور میں عروج وترقی کے باوجود آخر انسانیت کیوں تباہ ہورہی ہے؟ اس کی بے چینی روز بروز کیوں بڑھتی جارہی ہے اور اس کے اضطراب وانتشار میں آئے دن کیوں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔آخر اس کا حل کیا ہے۔ان کو کیسے دور کیا جاسکتا ہے،قرآن مجید کی ایک چھوٹی سی آیت اس کا جواب دے رہی ہے: **أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوب**۔(سورہ رعد:28)،سنو! اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے، یہ چھوٹی سی آیت ہمیں بتارہی ہے کہ آج دنیا سکون کے اسباب چاہے جتنا پیدا کرلے، اصل سکون تو اسی وقت حاصل ہوگا کہ انسان ذکر خداوندی سے غافل نہ ہو اور اگر یہ دولت اسے مل گئی تو دنیا کی ساری دولت اس کے سامنے ہیچ ہے، دنیا کے سارے اسباب سکون اس کے پاس نہ ہوں تو کوئی غم نہیں، تنہا یہ سکون اس کے لیے کافی ہے۔یعنی دولت وحکومت،

منصب و جاگیرداری، مادی ایجادات واکتشافات، ظاہری عروج وترقی، اسباب راحت کی فراوانی ان میں سے کوئی چیز بھی انسان کو حقیقی سکون واطمینان سے ہم کنار نہیں کرسکتی۔صرف یاد الٰہی اور ذکر اللہ کا نور ہی دلوں سے ہر طرح کی وحشت، گھبراہٹ، بے چینی اور اضطراب وانتشار کو دور کرسکتا ہے۔سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جسے قلب شاکر اور لسانِ ذاکر کی دولت مل گئی اسے دارین کی بھلائی مل گئی۔(مشکوٰۃ ص:282)ایک دوسری آیت میں اللہ نے ارشاد فرمایا: فَاذْكُرُونِیْ أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِیْ وَلاَ تَكْفُرُون۔(پس تم میرا ذکر کرو، میں تمھیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر ادا کرتے رہو اور ناشکری نہ کرو)۔(سورہ بقرہ:152)غور کریں اللہ نے ہمیں ایک مکمل انسان بنایا، پکڑنے کے لیے ہاتھ، چلنے کے لیے پاؤں، کھانے کے لیے منھ، دیکھنے کے لیے آنکھ، سونگھنے کے لیے ناک اور سمجھنے کے لیے دل ودماغ عطا فرمائے، کیا خدا کے سوا کوئی اور ہے جس نے یہ نعمتیں ہمیں عطا فرمائی ہوں، اسی طرح زندگی گزارنے کے لیے روٹی، کپڑا اور مکان اور روپئے، پیسے، آل واولاد کس نے عطا کی؟ کیا انسان صرف اپنے بل بوتے پر ان چیزوں کو حاصل کرسکتا ہے؟ ہرگز نہیں، جس خدا نے ہمیں ساری چیزیں عطا فرمائی ہیں ،وہی ہمیں دلی سکون واطمینان بھی عطا کرے گا اس کی ربوبیت وخالقیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس کے احسانات وانعامات کو ہر آن یاد رکھیں اور یاد رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر وقت اس کے ذکر سے اپنی زبان کو تر رکھیں اس سے محبت کا اظہار کریں، اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کریں، اس کی عبادت کریں، مامورات کو بجالائیں، منہیات سے مکمل اجتناب کریں، گناہ ہو جائے تو توبہ واستغفار کریں۔

فقہ وفتاوی

فقہی تجاویز

فقہی اجتماعات جس میں نئے مسائل پر غور وخوض کے لیے پورے ملک کے حضرات مفتیان جمع ہوتے ہیں اور اجتماعی غور وخوض کرتے ہیں اور آخر میں تجاویز طے ہوتی ہے یہ تجاویز بڑی اہمیت کے حامل ہوتی ہے اس لیے ذیل میں مباحث فقہیہ جمعیۃ علمائے ہند کے اٹھارہویں فقہی اجتماع اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے ۳۲ویں فقہی سیمینار کی تجاویز پیش کی جاتی ہے۔ (ادارہ)

تجاویز اٹھارہواں فقہی اجتماع منعقدہ ۱۵/تا ۱۷/ستمبر ۲۰۲۳ء
ادارہ مباحث فقہیہ، جمعیۃ علمائے ہند
تجاویز بابت مال حرام سے متعلق بعض مسائل کی تحقیق

(۱) سود، غصب، رشوت، چوری، جوا، سٹہ اور عقد باطل کے ذریعہ حاصل شدہ مال قطعی حرام ہے، جس کا حکم یہ ہے کہ اس کو اصل مالک کو لوٹانا ممکن نہ ہو تو دفع وبال کی نیت سے غرباء میں تقسیم واجب ہے، اور اس طرح کا مال اگر وراثت میں حاصل ہوا ہو اور اس کا مالک معلوم ہو، نیز واپس کرنا ممکن ہو تو مالک تک اس مال کا پہنچانا ضروری ہے۔ اور اگر مالک معلوم نہ ہو یا معلوم تو ہو؛ لیکن اس تک پہنچانا ممکن نہ ہو تو ایسے مال کو بھی فقراء پر تقسیم کرنا واجب ہے۔

(۲) شریعت میں جو اُمور ناجائز ہیں، مثلاً: نوحہ کرنا، ناچ گانا اور بلاضرورت تصویر کشی وغیرہ کو ذریعہ معاش بنانا جائز نہیں ہے۔ اوران سے حاصل شدہ آمدنی بھی ناجائز ہے۔

(۳) جو امور فی نفسہ جائز ہیں؛ لیکن وہ گناہ اور معصیت کا سبب بنتے ہیں، تو ان کو حتی

الامکان ذریعہ آمدنی نہیں بنانا چاہئے؛ تاہم ان کی آمدنی حرام نہ ہوگی۔

(۴) خریدار پر حلال مال سے ہی واجب الاداء ثمن کوادا کرنا لازم ہے؛ لیکن اگر کسی وجہ سے حرام مال سے ادائیگی کردی تو اس سے خریدے ہوئے سامان کے منافع اس کے لئے حرام نہ ہوں گے؛ البتہ خریداری میں صرف کردہ حرام مال کے بقدر اصل مالک تک پہنچانا ورنہ فقراء پر خرچ کرنا ضروری ہوگا۔

(۵) فروخت شدہ سامان کی قیمت، گاڑی یا مکان کا کرایہ، اسکول یا مدرسہ کی فیس وغیرہ ایسے شخص سے وصول کرنا جائز ہے جس کا ذریعہ آمدنی بظاہر حرام ہو۔

(۶) اگر کسی شخص کے پاس حلال اور حرام مال الگ الگ ہوں اور یہ معلوم ہو کہ وہ حلال مال میں سے ہی خرچ کررہا ہے تو اس کی دعوت قبول کرنا اور اس سے ہدیہ وغیرہ لینا جائز ہے۔ اور اگر متعین طور پر معلوم ہو جائے کہ وہ حرام مال پیش کررہا ہے تو اُسے لینا جائز نہ ہوگا۔ اور اگر حلال اور حرام مال مخلوط ہو تو جو وہ اپنے حلال حصہ کے بقدر مال میں سے پیش کرے تو قبول کرنا درست ہے۔ اور اگر اس کا علم نہ ہو؛ لیکن حرام مال غالب ہو تو اس کے یہاں دعوت کھانا اور ہدیہ وغیرہ قبول کرنا جائز نہیں ہے۔

(۷) کسی ایسے محلہ میں دوکان کھولنا جہاں اکثر لوگ ناجائز کاروبار میں ملوث ہوں فی نفسہ جائز ہے؛ البتہ احتیاط یہ ہے کہ ایسی جگہوں پر دوکان کھولنے سے پرہیز کیا جائے۔

تجویز (۲) اجتماعی قربانی سے متعلق بعض تحقیق طلب مسائل:

قربانی دین اسلام کا اہم شعار ہے، جس طرح قربانی کرنا عبادت ہے، اسی طرح اس کی ادائیگی میں تعاون کرنا بھی کارثواب ہے۔ آج کل بدلتی ہوئی صورتِ حال میں اِجتماعی قربانی کی ضرورت پیش آتی ہے؛ لہٰذا دوسروں کی طرف سے قربانی کا نظم کرنے والے اَفراد اور اِداروں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اس عمل کو عبادت سمجھ کر پوری امانت ودیانت کے ساتھ انجام دیں، کیوں کہ یہ معاملہ اپنے اندر مختلف جہتیں رکھتا ہے، اس لئے اس موضوع پر غور وفکر کے بعد مندرجہ ذیل تجاویز منظور کی گئیں:

(۱) مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اپنی قربانی انفرادی طور پر خود کرنے کی کوشش کریں، یہ

زیادہ موجب ثواب ہے؛ تاہم معتبر اجتماعی نظام کے تحت بھی قربانی کرانا جائز ہے۔

(۲) اجتماعی قربانی کے نظام میں مجموعی حصہ داروں کی نیت سے بھی جانوروں کی بلا تعیین قربانی درست ہوجائے گی۔

(۳) اگر تمام شرکاء جانور میں سے اپنے اپنے حصہ کا پورا گوشت لینا چاہتے ہوں تو وزن کے ساتھ تقسیم کیا جانا یا کم از کم ہر حصے کے ساتھ گوشت کے علاوہ دوسرے اعضاء (مثلاً: سری، پائے، چربی، گردہ اور دل) کے ٹکڑے رکھ دینا ضروری ہے۔

(۴) الف:-قربانی کا نظم وانتظام کرنے والے ادارے اگر جانوروں کی قیمت کا تخمینی اندازہ لگا کر فی حصہ متعین رقم کا اعلان کردیں اور اس کے مطابق رقومات وصول کریں اور رقم کم پڑنے کی صورت میں مزید مطالبہ کرنے کی صراحت بھی کریں یا یہی طریقہء کار ادارہ میں معروف ہو تو قبل از تعیین جانور کے ہلاک ہونے یا عیب دار ہونے کی ذمہ داری ادارے کی ہوگی، اور تعیین کے بعد اگر ہلاکت ہو یا عیب پایا جائے تو یہ حصہ دار کا نقصان شمار ہوگا۔ ب:- اگر ادارہ متعینہ رقم لے کر قربانی کرنے کی پوری ذمہ داری لیتا ہے اور رقم کم پڑنے یا زیادہ ہونے پر حصہ دار سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا تو اس طریقہ پر شرعی اُصول وضوابط کے مطابق قربانی کرنے کی اجازت ہے۔ ایسی صورت میں قربانی کرانے والے ہر قسم کے نفع ونقصان سے برء الذمہ ہوں گے۔

(۵) قربانی کی رقم وصول کرنے والوں کے اخراجات کو بھی (عرف کے مطابق) دیگر اخراجات میں شامل کر کے حصہ داروں سے وصول کرنے کی گنجائش ہے۔

(۶) مدرسہ کے مال سے قربانی کے جانوروں کی حتی الامکان خریداری نہ کی جائے، اہل مدارس کو چاہئے کہ جانور فراہم کرنے والے لوگوں سے ادھار خریداری کا معاملہ کریں اور حصص کی رقومات حاصل ہونے کے بعد واجب الاداء رقم ان کے حوالے کردیں۔

تجاویز بتیسواں فقہی سیمینار منعقدہ ۱۸/تا ۲۰/نومبر ۲۰۲۳ء

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

تجاویز بابت حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل:

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے ۳۲ ویں فقہی سیمینار منعقدہ ۱۸-۲۰ نومبر ۲۰۲۳ء،

بمقام جامعۃ الاسوۃ الحسنہ پلا پٹی تمل ناڈو میں حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل' پرغور وخوض اور بحث ومناقشہ کے بعد درج ذیل تجاویز منظور کی گئیں:

1۔(الف) حرام (سود، غصب، رشوت، چوری، جوا، سٹہ اور عقدِ باطل) کے ذریعہ حاصل شدہ مال قطعی حرام ہے، جس کا حکم یہ ہے کہ اصل مالک کو لوٹا دیا جائے اور اگر اصل مالک کو لوٹانا ممکن نہ ہو تو دفعِ وبال کی نیت سے غرباء میں تقسیم کرنا واجب ہے۔

(ب) اس طرح کا مال اگر وراثت میں حاصل ہوا ہو اور اس کا مالک معلوم ہو، نیز واپس کرنا ممکن ہو تو مالک تک اس کا پہنچانا ضروری ہے اور اگر مالک معلوم نہ ہو، یا معلوم ہو، لیکن اس تک پہنچانا ممکن نہ ہو تو اس مال کو بھی فقراء میں تقسیم کرنا واجب ہے۔

(ج) اگر وارث نے وراثت میں ملے ہوئے مالِ حرام سے کاروبار کیا تو اس کی آمدنی حلال ہوگی، البتہ حرام مال کے بقدر اس پر صدقہ کرنا واجب ہے۔

2- اگر شوہر یا بیٹے کی پوری یا اکثر آمدنی حرام ہو اور عورت کے پاس گزارے کی کوئی اور صورت نہ ہو تو اس مجبوری کی صورت میں شوہر یا بیٹے کے مال کو استعمال کرنے کی گنجائش ہے۔

3-جس شخص کی تعلیم مالِ حرام سے ہوئی ہو، وہ تعلیم پانے کے بعد کوئی جائز ملازمت کرے تو اس کی آمدنی حلال ہے، البتہ بہتر ہے کہ کمائی کے بعد مالِ حرام کے بقدر حرام کی تلافی کی نیت سے صدقہ کردے۔

4-اگر کسی کے پاس حلال وحرام دونوں مال ہو اور دونوں الگ الگ ہو اور یہ معلوم ہو کہ وہ حلال مال سے ہی خرچ کررہا ہے تو اس کی دعوت قبول کرنا اور اس سے ہدیہ لینا جائز ہے-اگر متعین طور پر معلوم ہو کہ مالِ حرام سے دعوت کررہا ہے تو اس کو قبول کرنا جائز نہیں ہوگا۔اگر حلال و حرام مخلوط ہوجائے تو جو وہ اپنے حلال حصے کے بقدر مال میں سے پیش کرے اس کو قبول کرنا درست ہے، اور اگر اس کا علم نہ ہو، لیکن حرام مال غالب ہو تو اس کے یہاں دعوت قبول کرنا یا ہدیہ لینا جائز نہیں ہے۔

5-اگر کسی کو معلوم نہ ہو کہ دعوت کرنے والے کا مال حرام تھا، اس لیے اس نے دعوت کھالی اور بعد میں معلوم ہوا تو اب توبہ واستغفار کرے اور بہتر ہے کہ کھانے کے بقدر مال صدقہ کردے۔

6-اگر کسی کے پاس حرام مال ہو اور اب وہ جائز کاروبار کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کو غیر سودی قرض نہیں مل رہا ہے اور تمام مال کو صدقہ کرنے میں شدید حرج ہے تو اس مال سے کاروبار کرنے کی گنجائش ہے اور بعد میں اس کو صدقہ کر دینا واجب ہے۔

7-اگر کسی شخص کو دورانِ ملازمت جائز و ناجائز دونوں طرح کے کام کرنے پڑتے ہوں اور کسی بھی شعبہ میں کام کرنا نادر نہ ہو تو ایسی ملازمت ناجائز ہے۔

8-فروخت شدہ سامان کی قیمت، گاڑی یا مکان کا کرایہ اور کسی طرح کی فیس وغیرہ ایسے شخص سے وصول کرنا جائز ہے جس کا ذریعہ آمدنی بہ ظاہر حرام ہے۔

9-سودی رقم کو کسی طرح کے بھی ذاتی مفاد میں استعمال کرنا درست نہیں ہے۔

تشبہ سے متعلق مسائل:

اللہ تعالی نے ہر انسان کے اندر اپنا تشخص قائم کرنے اور اس کی حفاظت کرنے کا جذبہ رکھا ہے- اسلام اس جذبہ کو اہمیت دیتا ہے- اس لیے اگر غیر مسلم بھائیوں کا کوئی گروہ اپنے لیے اپنی مذہبی یا تہذیبی شناخت کو قائم رکھنا چاہتا ہو اور اس سے دوسروں کو کوئی ضرر نہ ہو تو مسلمانوں کو اجازت نہیں دیتا ہے کہ وہ اس میں رکاوٹ بنیں، یا خلل پیدا کریں- اسی طرح اسلام مسلمانوں سے بھی مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی مذہبی و تہذیبی شناخت کو قائم رکھیں اور دوسری قوموں کا ایسا اثر قبول نہ کریں کہ اس سے ان کی اپنی دینی و قومی شناخت متاثر ہو جائے - چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو کسی اور قوم کی مشابہت اختیار کرے وہ انہی میں سے ہے: مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ - آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد معتبر طریقہ سے ثابت ہے اور اسی لیے فی الجملہ اس کے ضروری ہونے پر پوری امت کا اتفاق ہے- لہٰذا اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے ۳۲ ویں فقہی میں 'تشبّہ سے متعلق مسائل'، پر غور وخوض اور بحث ومناقشہ کے بعد درج ذیل تجاویز منظور کی گئیں:

1-کسی فرد یا جماعت کا کسی ایسی چیز کو جو کسی خاص قوم کی پہچان و امتیاز ہو، بالا رادہ اختیار کرنا تشبّہ ہے۔

2-جن امور کو عادتاً ایک طرح پر کیا جاتا ہے اور ان سے اسلام میں منع نہیں کیا گیا ہے تو

ان کو اسی طریقہ پر کرنے میں تشبّہ نہیں ہے۔

3-نئی ایجادات اور عام ضروریاتِ زندگی سے متعلق امور میں تشبّہ مباح ہے۔

4-کسی بھی قوم یا مذہب کی وہ خاص علامت جس سے ان کی شناخت ہوتی ہو، اس کو شعار کہتے ہیں، اور کسی دوسری قوم کا شعار اختیار کرنا جائز نہیں۔

5-اگر کسی قوم کا کوئی مروّج عمل اتنا عام ہو جائے کہ اب اس کو اس قوم کی پہچان نہ قرار دیا جائے تو اس میں تشبّہ کی جہت ختم ہو جائے گی۔

6-وہ امور جن کا تعلق عقیدہ وعبادات سے یا مذہبی عُرف وعادت سے ہے ان میں تشبّہ حرام ہے اور ان کی بعض صورتوں میں کفر کا اندیشہ ہے۔

7-صلیب لٹکانا، زُنّار پہننا، قشقہ لگانا، ہولی کھیلنا، دیوالی میں دیا جلانا، کرسمس میں شریک ہونا، یوگا کرنا، یا اس طرح کے دوسرے مذہبی اعمال، یہ سب مذہبی تشبّہ کے دائرہ میں آتے ہیں اور یہ سب ناجائز ہیں۔

8-سرسوتی وندنا، سوریہ نمسکار، وندے ماترم، بائبل یا گیتا سے مشرکانہ دعائیہ کلمات پڑھنا، دیوی دیوتاؤں کے سامنے ہاتھ جوڑنا، یا ان کے نام کے نعرے لگانا، حضرت مسیح کے مجسّمہ و فوٹو کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہونا، یہ سب دیگر مذاہب کے مذہبی شعار ہیں۔ ان سے بچنا لازمی ہے اور ان کے ارتکاب کی وجہ سے دائر؟ ایمان سے نکل جانے کا اندیشہ ہے۔

9-لباس میں اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ اس سے ستر پوشی کے تقاضے پورے ہو رہے ہوں، نیز دوسری قوموں کے مروّج لباس کی نقّالی بھی نہ ہو، لہٰذا ساڑی، دھوتی جن علاقوں میں غیر مسلموں کا لباس نہیں ہے اور وہ ساتر بھی ہوں اور ان کے پہننے سے شناخت مشتبہ نہ ہو تو ان کے استعمال کی گنجائش ہے- اسی طرح کوٹ پینٹ اور ٹائی، جو اب کسی قوم کے ساتھ خاص نہیں، ان کے استعمال کی بھی اجازت ہے۔

10-ٹکلی اور سندور کا استعمال جن علاقوں میں غیر مسلموں کے ساتھ خاص ہے وہاں اس کا استعمال مسلم خواتین کے لیے جائز نہیں۔

11 - دوسری اقوام کی نقل میں یا نفع ونقصان کے عقیدہ سے ہاتھوں وغیرہ میں دھاگہ

باندھنا ناجائز ہے اور مشرکانہ عمل ہے۔

12 - مکانات کی تعمیر یا اس کی خریداری میں واستو کی رعایت کو ضروری تصور کرنا، نیز مکان کے دروازوں اور نئی خریدی گئی گاڑیوں پر لیموں مرچ کا لٹکانا مشرکانہ عمل ہے۔

13 - نیا سال منانا ایک غیر اسلامی عمل ہے- اسی طرح بچوں کے یومِ پیدائش اور شادی کی سال گرہ منانا وغیرہ بھی غیر اسلامی طریقہ ہے، اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

14 - اپریل فول منانا دھوکہ اور جھوٹ پر مبنی ہونے کی وجہ سے قطعاً ناجائز ہے۔

15 - مردوں کی مشابہت اختیار کرتے ہوئے ان کے طریقہ پر چھوٹے بال رکھنا خواتین کے لیے درست نہیں ہے۔

16 - مردوں کے لیے کان اور گلے میں زیور پہننا، ہاتھ میں سونا، چاندی یا لوہے کا کڑا پہننا ناجائز ہے۔

17 - عورتیں جس طرح کے شوخ رنگ اور چھینٹ کے رنگ کے کپڑے پہنتی ہیں، مشابہت کی وجہ سے مردوں کو اس طرح کے کپڑے پہننا مناسب نہیں ہے۔

18 - زیب وزینت میں مبالغہ مردوں کے لیے زیب نہیں ہے، اس لیے مروّجہ راجستھانی شیروانی اور ایسے کپڑے جن میں تزئین کاری میں مبالغہ اختیار کیا جائے، نامناسب ہے۔

19 - زیب وزینت کے لیے مردوں کو ہاتھ پاؤں میں مہندی وغیرہ لگانا جائز نہیں۔

3 سرمایہ کاری سے متعلق بعض نئے طریقے۔

مال انسانی زندگی کی بنیادی ضرورت ہے اور بعض عبادتیں بھی اس سے متعلق ہیں، اس لیے کسبِ معاش اسلام کی نظر میں ایک بہتر امر اور بعض حالات میں ضروری ہے- لیکن شریعت نے اس کے لیے حلال وحرام کی حدود مقرر کی ہیں، جن کا مقصد یہ ہے کہ انسان کا کوئی عمل اس کے خالق کی رضا کے خلاف نہ ہو اور اس سے دوسرے انسانوں کو ضرر نہ پہنچے- مگر افسوس کہ اس وقت دنیا میں جو معاشی نظام قائم ہے اس میں ایسی ممنوع باتیں بھی شامل ہیں جن کو شریعت میں بہ تاکید منع کیا گیا ہے اور ساتھ ہی اس میں انسانی سماج کا نقصان اور استحصال بھی ہے- اس صورتِ حال کو سامنے رکھتے ہوئے موجودہ دور کے فقہاء نے شریعت کے دائرہ میں سرمایہ کاری کی

شکلیں پیش کی ہیں۔ اکیڈمی کے اس سمینار نے ان شکلوں پر غور کیا اور درج ذیل تجاویز منظور کیں:

1 - مضاربتِ استمراری یعنی عقدِ مضاربت میں سرمایہ کاری کی مدت کا متعین نہ ہونا اور درمیان سال میں نئے نئے اربابِ اموال کا داخل ہونا اور سرمایہ لگانے والوں کا حسبِ موقع اپنے سرمایہ اور اس کے نفع کو لے کر علیحدہ ہوجانا اصولِ شریعت کے مطابق ہے اور مضاربت کی معروف شکل کی طرح یہ بھی جائز ہے۔

2 - کمپنی کے نقد اثاثے اور ٹھوس اثاثوں کی قیمت کا اندازہ لگا کر نفع و نقصان متعین کرنے کو 'تخصیصِ تقدیری' کہتے ہیں، جو آج کل غیر سودی مالیاتی اداروں میں مروّج ہے اور یہ جائز ہے۔

3 - شخصِ قانونی کا تصور اصولِ شریعت کے خلاف نہیں، اس لیے کمپنی کو شخصِ قانونی کا درجہ دیا جانا درست ہے اور اس کا مُضارِب یا رَبُّ المال کی حیثیت سے معاملہ کرنا درست ہے۔

4 - مالیاتی ادارہ یا فرد کے ساتھ مل کر کسی چیز کو خریدنے اور اس کے بعد شریک کے حصہ کو کرایہ پر لینے اور ساتھ میں مزید رقم ادا کرکے رفتہ رفتہ اس کے حصہ کا مالک بن جانے اور ملکیت کے تناسب سے کرایہ کے کم ہوتے رہنے کا معاہدہ کرکے اس کے مطابق معاملہ کرنا، جس کو موجودہ غیر سودی مالیاتی اداروں کی اصطلاح میں 'شرکتِ متناقصہ' کہتے ہیں، جائز ہے۔

5 - غیر سودی مالیاتی اداروں میں مرابحہ کی رائج یہ شکل جس میں ادارہ مطلوبہ سامان کی خریداری کے خواہش مند کو ہی اپنی طرف سے کسی متعینہ جگہ سے خریدنے کا وکیل بنا دیتا ہے اور خواہش مند ادارہ کی رہنمائی کے مطابق خرید کر رسید اپنے نام سے بنوالیتا ہے اور اس کے بعد ادارہ کو اطلاع دے کر اس سے اپنے لیے ادھار خریدنے کا معاملہ کرلیتا ہے تو یہ طریقہ اختیار کرنا جائز ہے۔

6 - جن کمپنیوں کا اصل کاروبار حلال ہو، لیکن کمپنی جزوی طور پر حرام کاروبار میں بھی ملوّث ہو اور حرام کاروبار میں لگنے والا سرمایہ کمپنی کے کل سرمایہ کے ایک تہائی سے کم ہو تو ایسی کمپنیوں کے شیئرز خریدنے کی گنجائش ہے، بہ شرطے کہ کمپنی کی حرام سرمایہ کاری کے خلاف بقدر استطاعت اپنا اختلاف درج کرادے اور اس حرام سرمایہ کاری سے حاصل شدہ نفع کو صدقہ کردے۔

فقہ وفتاوی

پانچویں قسط

سود کے چند مسائل

امانت علی قاسمی

استاذ و مفتی دار العلوم وقف دیوبند

زائد کرایہ میں سودی رقم دینا:

سوال: کچھ احباب بیرون ملک گئے اور کورونا کی وجہ سے لاک ڈاؤن میں پھنس گئے اور انٹرنیشنل ساری فلائٹ کینسل کر دی گئیں پھر حکومت کی طرف سے اسپیشل فلائٹ چلائی گئیں جس کا کرایہ نارمل ریٹ سے تقریباً 30/40 ہزار روپے زائد لیا گیا اب وطن واپسی کرنے والوں کی مجبوری تھی کہ وہ ٹکٹ پر زائد رقم بھی ادا کریں اس کے علاوہ کوئی دوسرا آپشن نہیں تھا۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس رقم کو بینک کی سودی رقم سے ادا کیا جا سکتا ہے؟

جواب: مذکورہ صورت میں سود کی رقم کا استعمال جائز نہیں ہے اس لیے کہ سودی رقم کو یا تو جہاں سے وصول ہوئی ہے وہاں واپس کر دی جائے یا بلا نیت ثواب غرباء میں تقسیم کر دی جائے اپنے کسی مفاد میں سود کی رقم کا استعمال جائز نہیں ہے۔ **قالوا لو مات الرجل و كسبه من بيع الباذق أو الظلم أو أخذ الرشوة يتورع الورثة، ولا يأخذون منه شيئا وهو أولى بهم ويردونها على أربابها إن عرفوهم، وإلا تصدقوا بها لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه اهـ.** (الدر المختار ورد المحتار 6/385)۔

کمیٹی چلانے کی ایک صورت:

سوال: 20 افراد نے مل کر کہا کہ "کمیٹی" ڈالی جائے جس کی صورت یہ ہے کہ تمام لوگ کمیٹی میں ۵/ ہزار روپے ڈالیں گے اور جب ایک لاکھ روپے جمع ہو جائیں گے تو اس کو کمیٹی ڈالنے والا لے گا اور دوسری مرتبہ کے لیے سب لوگ بولی لگائیں گے کہ کون دوسری کمیٹی وصول

کرے گا جو بھی کم مقدار میں کمیٹی لینے پر راضی ہوگا اس کی ہی ہوگی مثلا وہ 80 ہزار پر راضی ہوا و رکوئی دوسرا شریک اس سے کم پر راضی ہو کمیٹی کم بولی لگانے والے کے سپرد کی جائے گی لہذا سب پر رقم کے مطابق رقم عائد ہوگی اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہے گا اور جو سب سے اخیر میں کمیٹی وصول کرے گا وہ ایک لاکھ روپیے وصول کرے گا کیوں کہ آخر میں کوئی نہیں ہے جو اس سے کم پر راضی ہو لہذا آخر میں لینے والے کا فائدہ ہوجاتا ہے اس طرح کی کمیٹی ڈالنے کا کیا حکم ہے براہ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔

جواب: کمیٹی ڈالنے کی مذکورہ صورت درست نہیں ہے؛ اس لیے کہ مذکورہ اسکیم سود وقمار پر مشتمل ہے کیوں کہ ایک آدمی ایک لاکھ روپیے جمع کرتا ہے جب کہ اس کو کبھی 80 ہزار ملتا ہے اور کسی کو ایک لاکھ سے زائد ملتا ہے یعنی بعض کو نفع ہوتا ہے اور بعض کو نقصان جس کا کوئی بنیادی سبب نہیں ہے اور جو کمی اور زیادتی بلا سبب کے ہو وہ سود ہوتا ہے اور سود ہونے کی وجہ سے یہ درست نہیں ہے اور چوں کہ بعض کو امید ہے کہ زیادہ مل جائے گا جب کہ بعض کو نقصان کی بھی امید ہے اس لیے یہ قمار ہے۔۔اس کی جائز صورت یہ ہے کہ ہر شخص ماہانہ ایک ہزار رقم جمع کرے اور قرعہ اندازی کے ذریعہ کسی ایک کا نام نکال لیا جائے اور ساری رقم اس کو دے دی جائے، اس طرح ہر شخص کو پورے تیس ہزار ملیں گے، اور جو شخص اس اسکیم کو چلاتا ہے وہ کام کی وجہ سے پہلے ماہ کی چھٹی لے سکتا ہے۔ **عبد الرحمن بن رافع في أبيه عن عبد الله بن عمرو، قال: قال رسول الله - صلى الله عليه وسلم -: إن الله حرم على أمتي الخمر، والميسر، والمزر، والكُوبَةَ، والقِنِّين، وزادني صلاةَ الوتر، قال يزيد: القِنِّين: البَرَابطُ.** (مسند احمد ت۔شاکر، اول مسند عبداللہ بن عمرو 6/118) **وحرم لو شرط) فيها (من الجانبين) لأنه يصير قمارا۔(الدر المختار) قوله لأنه يصير قمارا) لأن القمار من القمر الذي يزداد تارة وينقص أخرى، وسمي القمار قمارا لأن كل واحد من المقامرين ممن يجوز أن يذهب ماله إلى صاحبه، ويجوز أن يستفيد مال صاحبه وهو حرام بالنص** (فتاوی شامی، فصل فی البیع، 6/403)

سرکاری اسکیم جس میں سود معاف ہو:

سوال: سرکار کسانوں کو لون دیتی ہے اور اس پر سود معاف کر دیتی ہے لیکن رقم لوٹاتے وقت وہ سود کی رقم وصول کر کے آنے والے سال اکاؤنٹ میں سود کی رقم واپس کر دیتی ہے۔ ایسی

صورت میں کچھ دنوں تک سود کی رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: حکومت کی جانب سے زراعت کی ترقی کے لیے کسانوں کولون کی جو اسکیم دی جاتی ہے اس میں چوں کہ سود معاف ہے اس لیے یہ شرعی اعتبار سے غیر سودی قرض کی صورت ہے، اور اس میں رقم لوٹاتے وقت سود کے نام سے جو پیسہ لیا جاتا ہے وہ شرعی اعتبار سے سود اس لیے نہیں ہے کہ اس میں واپسی کی شرط ہوتی ہے پس وہ بحکم قرض ہے، سود نہیں، اس لیے مذکور قرض کی اسکیم جائز ہے، اس سے نفع اٹھانے کی گنجائش ہے۔

انکم ٹیکس میں سودی رقم دینا:

سوال: انکم ٹیکس میں بینکوں سے حاصل شدہ سودی رقم دینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: کسی سرکاری بینک میں جمع شدہ رقم پر جو سود ملتا ہے اس کو انکم ٹیکس میں دینا جائز ہے؛ کیوں کہ انکم ٹیکس شریعتِ اسلام میں کی نظر میں ایک ناواجبی ٹیکس ہے اور اس میں سرکاری بینک سے ملا ہوا سود بھرنا یہ ردالی رب المال کی ایک صورت ہے۔

تعلیم کے لیے سودی قرض حاصل کرنا:

سوال: تعلیم کے لیے سودی قرض حاصل کرنا درست ہے یا نہیں؟ بسا اوقات بہت دور تک تعلیم حاصل ہو جاتی ہے اور آخری مرحلے میں بہت زیادہ پیسے خرچ کرنے پڑتے ہیں اور اس کی استطاعت نہیں ہے اب اگر سودی قرض نہ لیں تو مکمل تعلیم ضائع ہو جائے گی کیا مجبوری کی صورت میں تعلیمی قرض لینے کی گنجائش ہے؟

جواب: سود کا لینا دینا حرام ہے اس لیے تعلیم کے لیے بھی سودی قرض لینا درست نہیں ہے بلکہ کوشش کرے کہ غیر سودی قرض حاصل کر کے اپنی تعلیم کو مکمل کرے۔اس سلسلے میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی تجویز ہے: جس طرح سود کا لینا حرام ہے اسی طرح شریعت نے سودی قرض لینے او رسود ادا کرنے کو بھی حرام قرار دیا ہے اس لیے بنیادی طور پر تعلیم کے لیے سودی قرض حاصل کرنا جائز نہیں البتہ اگر کسی کے پاس مالی گنجائش نہ ہو، غیر سودی قرض نہ مل پائے اور اس کے مطلوبہ تعلیم سے محروم رہ جانے کا اندیشہ ہو تو ایسے طلبہ کو چاہیے کہ کسی معتبر مفتی کے سامنے اپنے حالات رکھ کر ان کے مشورے پر عمل کریں (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے، 249)

کاروبار شروع کرنے کے لیے سود لینا بعد میں بینک سے سود حاصل کر کے اس کو وصول کرنا:

سوال: اگر میں کاروبار شروع کرنے کے لیے بینک سے لون لوں جس پر سود دینا ہوگا۔ لون کی ادائیگی تک جو بھی سود کی رقم ہوگی وہ میں میری حلال کمائی میں سے بھر دوں گا۔ بعد میں میں بینک میں اپنا روپیہ رکھ کر لون میں گیا سود واپس لے لوں گا تو اس طرح سود کی رقم سود میں برابر ہو جائے گی۔ کیا یہ طریقہ صحیح اور حلال ہے۔

جواب: اسلام میں سود دینا اور سود لینا دونوں حرام و ناجائز ہیں اور احادیث میں سود لینے والے اور سود دینے والے دونوں پر لعنت آئی ہے؛ اس لیے کوئی کاروبار شروع کرنے کے لیے بینک سے لون لینا یا سود لینے کی غرض سے بینک میں پیسے جمع کرنا ناجائز وحرام ہے، آپ ایسا ہرگز نہ کریں؛ البتہ اگر کسی نے ماضی میں مسئلہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے بینک سے لون لیا، جس میں اسے سود بھرنا پڑا اور بعد میں قانونی مجبوری کی وجہ سے اسی بینک میں کچھ پیسے رکھنے پڑے تو ایسی صورت میں جمع شدہ پیسوں پر ملنے والے سود میں سے ماضی میں اسی بینک میں جو سود بھرا گیا، اس کے بہ قدر پیسے اپنے استعمال میں لانا درست ہے، یہ ایسا ہے جیسے کسی کا جائز وحلال پیسہ کسی نے غیر شرعی طریقہ پر لیا، پھر اس نے کسی دوسرے راستہ سے اپنا پیسہ واپس لے لیا (امداد المفتین ص ۷۰۶، سوال: ۷۴۳، مطبوعہ: دار الاشاعت کراچی)۔

قال اللّٰہ تعالی: وأحل الله البيع وحرم الربا الآية (البقرة: ۲۷۵)، عن جابر بن عبد اللّٰہ رضي اللّٰہ عنهما قال: لعن رسول اللّٰہ صلى اللّٰہ عليه وسلم آكل الربوا ومؤكله وكاتبه وشاهديه، وقال: هم سواء (الصحيح لمسلم، ۲: ۲۷، ط: المكتبة الأشرفية ديوبند)، الربا فضل خال عن عوض بمعيار شرعي مشروط لأحد المتعاقدين في المعاوضة (تنوير الأبصار مع الدر والرد، كتاب البيوع، باب الربا، ۷: ۳۹۸-۴۰۰، ط: مكتبة زكريا ديوبند): فإذا ظفر بمال مديونه له الأخذ ديانة؛ بل له الأخذ من خلاف الجنس (رد المحتار، كتاب السرقة، مطلب في أخذ الدائن من مال مديونه من خلاف جنسه ۶: ۱۵۷)

October-December 2023

Volume:2/ Issue:2

QUARTERLY SUBH E NO

TAALIMI WA MILLI BOARD
Champanagar, Bhagalpur, Bihar-812004